تحقیقی مضامین

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تحقیقی مضامین

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

Tahqeeqi Mazameen
by
Malik Ram
Rs.91/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011　　تعداد: 1100　　قیمت: -/91 روپے
ISBN : 978-81-7587-624-8　　سلسلۂ مطبوعات 1500

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر:49539000　فیکس: 49539099
ای میل urducouncil@gmail.com　ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922 میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور'' معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطّل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطّل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

انتساب

شیخ محمد اکرام (آئی، سی، ایس) مرحوم

کے نام

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش، کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

پیش گفتار

میں نے گذشتہ ۵۰-۶۰ برسوں میں ربط ویابس بہت کچھ لکھا۔ اس میں کم و بیش دو سو تو متفرق مضمون ہی ہونگے، مختلف موضوعات پر —— تاریخ، تنقید، تحقیق، تذکرہ اور رجانے کیا کیا۔ مستقل کتابیں تو کسی نہ کسی طرح شائع ہوگئیں، لیکن یہ مضامین رسائل و جرائد میں منتشر پڑے رہے، اور میں نے کوئی توجہ نہ کی۔

دس بارہ برس ہوئے، بعض احباب نے فرمایش کی کہ ان میں سے جو مضامین مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں، اور جنھیں کبھی نہ کبھی بطور حوالہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے، انھیں جمع کر کے مختلف عنوانوں کے تحت کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ میں نے ان کے مشورے کو ان کی محبت اور خوش فہمی پر محمول کیا، اور کوئی وعدہ کیے بغیر "اچھا۔ غور کرینگے"، کہہ کر ٹال دیا۔ اور بھول گیا۔ لیکن ان میں سے ایک دوست بھولنے والے نہیں تھے۔ چند ماہ بعد انھوں نے دریافت کیا کہ اس سلسلے میں آپنے کیا کیا؟ ظاہر ہے کہ میرا جواب تھا: "کچھ نہیں" اس پر وہ بہت بگڑے اور اصرار کیا کہ مضامین کے جمع کرنے کا کام فوراً شروع کر دینا چاہیے۔ انھوں نے کچھ ایسے انداز میں اپنے تعلق خاطر کا اظہار کیا کہ مجھے ہامی بھرنے اور وعدہ کر لینے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اب مضامین کی تلاش شروع ہوئی۔ جب یہ لکھے گئے ہیں، تو اس وقت میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ان کی ضرورت پڑیگی۔ میرے پاس ان کی اصل تھی نہ نقل۔ وہ تو خدا بھلا کرے عرش ملسیانی مرحوم کا کہ انھوں نے، خدا معلوم کیسے، ان کی (نامکمل ہی سہی) ایک اچھی خاصی فہرست تیار کر دی تھی۔ خیر، ہندستان اور پاکستان کے متعدد دوستوں نے ہاتھ بٹایا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کے پرانے رسالوں سے ان مضمونوں کی نقلیں اور عکس فراہم کیے۔ قدرتاً کام بہت آہستہ آہستہ ہوا کیونکہ مضامین کا جمع کرنا آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح گذشتہ دس بارہ برسوں میں چار مجموعے شائع ہوئے۔ اور پانچواں یہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

بیشک خدائے بزرگ و برتر ہر بات پر قادر ہے، لیکن اپنی صحت کی موجودہ حالت کے پیش نظر میرا خیال نہیں ہے کہ میں کوئی اور مجموعہ شائع کر سکونگا، حالانکہ ابھی تین چار مجموعوں کا مواد منتشر حالت میں پڑا ہے۔ کارِ دنیا کسے تمام نکرد۔ دعا ہے کہ جو کچھ ہو سکا ہے، خدائے کریم اسے قبولیت کا مقام عطا فرمائے، اور یہ کسی نہ کسی درجے میں اردو دنیا کے لیے مفید ثابت ہو۔ آمین!

نئی دلّی
یکم اکتوبر ۱۹۸۷ء

مالک رام

فہرست

پیش گفتار
۱. غالب کے فارسی قصیدے (کچھ نیا کلام) ۱۱
۲. قادر نامہ کا مصنّف ۳۴
۳. غالب کا ایک نیا خط ۴۱
۴. نادر خطوطِ غالب ۵۷
۵. دستنبو ۶۶
۶. غالب اور صہبائی ۸۴
۷. مولانا فضلِ حق خیر آبادی ۹۰
۸. ذوق کا مذہب ۱۳۴
۹. انشا کی تاریخِ ولادت و وفات ۱۳۸
۱۰. چیستانِ جرأت ۱۵۸
۱۱. اقبال کی تاریخِ ولادت ۱۷۳
۱۲. ہفتہ وار "کوہِ نور" لاہور ۱۹۸
۱۳. مخطوطات (تلاش، قرأت، ترتیب) ۲۳۴

غالب کے فارسی قصیدے

کچھ نیا کلام

بہت دن ہوئے میں نے غالب کا فارسی دیوان مرتب کیا تھا۔ اس کے لیے میں نے گیارہ نسخے استعمال کیے تھے ـــــ نو خطی اور دو ان کی زندگی کے مطبوعہ نسخے۔

افسوس کہ ایک مرحوم مہربان کے کرم کے صدقے یہ شائع نہ ہوا۔ خیر، یہ دوسرا قصہ ہے۔ ان میں تین مخطوطات ایسے تھے، جن سے غالب کے قصائد سے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوئیں انھیں سے متعلق کچھ تفصیلات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ان میں سے پہلا نسخہ کتاب خانۂ شرقیہ بانکی پور پٹنہ میں ہے۔ یہ ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ کے لیے لکھا گیا تھا۔ دوسرا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی) علی گڑھ کے ذخیرۂ شیفتہ میں ہے۔ یہ مکمل دیوان نہیں بلکہ یہ مخطوطہ پہلے نسخے کا تتمہ معلوم ہوتا ہے، اور غالباً یہ بھی شیفتہ ہی کے لیے لکھا گیا تھا، جسے ان کی دوسری کتابوں کے ساتھ ان کے پوتے نواب محمد اسمٰعیل خان مرحوم نے یونیورسٹی کے کتابخانے کی نذر کر دیا۔ تیسرا مخطوطہ نواب علاء الدین احمد خان والی لوہارو کا تھا۔ یہ لوہارو کے ریاستی کتابخانے میں تھا، جو ۱۹۵۷ء میں کتابخانۂ رضائیہ رام پور میں منتقل ہو گیا؛ اور اب بھی وہیں ہے۔

۲

غالب کے متداول فارسی دیوان میں ۶۴ قصیدے بہ تفصیل ذیل ملتے ہیں:

تحقیقی مضامین

توحید، نعت، منقبت — ۱ - ۱۲
محمد اکبر شاہ ثانی و شاہزادہ سلیم — ۱۳
بہادر شاہ ثانی ظفر — ۱۴ - ۲۸
ملکہ وکٹوریہ فرمانروائے انگلستان — ۲۹ - ۳۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل — ۳۲ - ۳۴
سر چارلس تھیو فیلس مٹکاف — ۳۵
سر جیمس ٹامسن لفٹنٹ گورنر صوبۂ مغرب و شمال (یوپی) — ۳۶
ہنری تھوبی پرنسپ، سکتر حکومت مرکزی — ۳۷
ٹامس ماڈوک 〃 〃 — ۳۸
اینڈریو اسٹرلنگ 〃 〃 — ۳۹
سر ولیم فریزر، ریذیڈنٹ، دلّی — ۴۰
جان رسل کالون، لفٹنٹ گورنر غرب و شمال (یوپی) — ۴۱
لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل — ۴۲
سر جارج فریڈرک اڈمنسٹن، سکتر حکومت مرکزی — ۴۳
لارڈ کیننگ گورنر جنرل — ۴۴
سر رابرٹ منٹگمری، لفٹنٹ گورنر پنجاب — ۴۵
فتح الملک میرزا غلام فخر الدین (عرف میرزا فخرو) ولی عہد ظفر — ۴۶ - ۴۸
نصیر الدین حیدر، شاہ اودھ (و روشن الدولہ نائب سلطنت اودھ) — ۴۹
امجد علی شاہ اودھ — ۵۰
واجد علی شاہ اودھ — ۵۱ - ۵۳
نواب یوسف علی خان والی رام پور — ۵۴ - ۵۵
نواب وزیر الدولہ، والی ٹونک — ۵۶ - ۵۷
مہاراجہ شیو دھیان سنگھ، والی الور — ۵۸

۵۹ مہاراجہ نرندر سنگھ، والیِ پٹیالہ
۶۰ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
۶۱ مولوی محمد صدر الدین خاں صدر الصدور
۶۲ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں
۶۳ نواب مختار الملک سالار جنگ اوّل
۶۴۔ بے عنوان (در مذمتِ روزگار)

ان میں سے متعدد قصیدے پہلے کسی اور کی مدح و ستائش میں لکھے گئے تھے اور بعد کو میرزا نے یہ کسی اور سے منسوب کر دیے۔ اس ردّ و بدل کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ان میں حذف و اضافہ کرنا پڑا، تاکہ قصیدہ نئے ممدوح کے حسبِ حال ہو جائے۔ اس طرح جہاں بعض نئے اشعار خاص طور پر لکھنا پڑے، وہیں پہلے قصیدے کے کچھ شعر ترک بھی کر دیے گئے۔ گویا اگر قصیدہ اپنی ابتدائی شکل میں رہتا تو یہ شعر ضائع نہ ہوتے اور آج ان کے کلام میں شامل ہوتے۔

۳

اب بعض قصیدوں کی کیفیت تفصیل سے ملاحظہ فرمائیے:

(۱) قصیدہ نمبر ۳۰

کلیاتِ مطبوعہ میں اس کا عنوان ہے: "سی ام قصیدہ در مدحِ شہنشاہِ انگلستان"۔ حالآنکہ علی گڑھ والے مخطوطے میں اس کا عنوان یہ ہے: "در تہنیتِ غسلِ صحتِ حضورِ اقدس"۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

در روزگار کس نتواند شمار یافت خود در روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

بہادر شاہ ظفر ۱۸۵۳ء میں بہت بیمار ہو گئے تھے اور بہت دن تک بیمار رہے تھے۔[۲] اس بیماری

۱۔ یہاں بیان کر دینا ضروری ہے کہ پہلے دونوں مخطوطوں سے متعلق جناب قاضی عبدالودود مرحوم کے مقالے علی الترتیب "معاصر" (پٹنہ) اور "نذرِ ذاکر" (دلّی) اور "نگر" (علی گڑھ) میں چھپ چکے ہیں۔ بالا ان کے بعض مضامین کی اس مقالے میں تکرار ہو گئی ہے۔ بہرحال قاضی صاحب مرحوم کے مضامین مکمل نہیں۔
۲۔ نادراتِ غالب ۱: ۴۲، ۴۳ و مابعد

کے بعد غسلِ صحت کے موقع پر غالب نے قصیدہ کہا تھا۔[۳] گمان غالب ہے کہ یہ وہی قصیدہ ہو۔ چونکہ اولاً یہ قصیدہ غسلِ صحت کے موضوع سے متعلق تھا اس لیے جب غالب نے اسے ملکہ وکٹوریہ سے منسوب کیا، تو بعض لفظی تغیر و تبدل کے علاوہ، اس میں سے وہ شعر بھی نکال دیے جن میں بادشاہ کی علالت اور صحتیابی کی طرف اشارہ تھا۔ مثلاً مطبوعہ دیوان طبع (۶۱۸۶۳) کے ص ۲۶۱ پر آخری شعر ہے:

عنوانِ رنگ و بو رقمِ دل فروز جست　　　بستانِ آرزو شجرِ میوہ دار یافت

علی گڑھ کے نسخے میں اس کے بعد یہ چار شعر زائد ہیں، جو مطبوعہ کلیات میں نہیں ملتے:

رنج از نہادِ خسروِ دیندار رخت بست　　　مقبول شد دعا و دوا اعتبار یافت

طرفِ کلہ قسم بسرِ تاجدار خورد　　　رُوے نگیں نشاں ز شہِ نامدار یافت

گردد دوتا، چو رشتہ شود استوار تر　　　عُمرِ دوبارہ خسروِ فرخ تبار یافت

آرے، ز عمرِ خضر و مسیحا بُرد و گرد　　　ایں نقدِ زندگی کہ شہنشہ دوبار یافت

ظاہر ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کی مدح کے قصیدے میں ان اشعار کی کوئی مناسبت نہیں تھی، لہذا انھیں خارج کر دیا۔ اس کے بعد کا شعر ہے:

دولت سپند سوخت کہ شد مُلک تازہ رُوے　　　مُلک آفریں سرود کہ دولت مدار یافت

پہلے یہ شعر یوں تھا:

دولت سپند سوخت کہ دیں تازہ رُوے شد　　　دیں آفریں سرود کہ دولت مدار یافت

اس شعر میں لفظ دیں سے بہادر شاہ کی دینداری اور مذہب و تصوف سے شغف کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ اس لیے اسے خارج کر کے اس کی جگہ ملک لکھا گیا۔ اس کے بعد یہ دو شعر نئے شامل قصیدہ ہوئے، جو اصلی قصیدے میں نہیں تھے:

از انتظامِ شاہی و آیینِ خسروی　　　سود و سرور و دانش و داد انتشار یافت

برخستگانِ ہند ببخشود از کرم　　　وکٹوریہ کہ رونق از و روزگار یافت

اسی قصیدے میں کلیاتِ مطبوعہ کے ص ۲۶۲ پر شعر ہے:

۳۔ ایضاً، ۴۹ (خط نمبر ۳۵)

نازد چناں بخویش کہ بالد بروے تخت — از بسکہ تاج کام دل اندر کنار یافت

پہلے مصرعِ ثانی میں از بسکہ کی جگہ امروز تھا۔ نیز اس کے بعد یہ دو شعر زائد تھے، جواب نہیں ملتے:

جشنے است چشم روشنیِ شہریار را — خود چشم شہر روشنی از شہریار یافت

صاحبقرانِ صورت و معنی، ابو ظفر — کز نام وے قلم نفسِ مشکبار یافت

کلیات کے اسی صفحے پر شعر ہے:

ہمت نخواست بادہ ز انگور ساختن — در دورِ شہ بمیکدہ پروینِ فشار یافت

پہلے ہمت کی جگہ تقویٰ تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کے بیان میں، جس کے ہاں شراب پینے پر کسی طرح کی پابندی نہیں تھی، یہ لفظ بے محل تھا۔ اس کے بعد یہ دو شعر تھے، جو خارج ہو گئے:

رضوانِ ز پیشگاہِ خداوندِ نور و نار — فرمانِ نخل بندیِ دہلی دیار یافت

حورانِ خلد تا چہ بہم گفتگو کنند — زاں پیچ و تاب ہا کہ درین شاخسار یافت

اسی طرح شعر:

گل را ز جوشِ رنگ بہنگامہ جا کجاست — آورد گر بہار، تنش را نگار یافت

کے بعد یہ دو شعر بھی تھے:

در بزم بسکہ رنگ ہمی بارد از ہوا — ہر سادہ رو کہ بخبر آں جا گزار یافت

تا دست در شکستنِ طرف کلہ زد — بر رخ نشانِ غازہ و بر کف نگار یافت

موجودہ قصیدے کے یہ دو شعر خاص تئے ممدوح کے لیے لکھے گئے:

تاج و نگیں علامتِ شاہی است در جہاں — ایں ہر دو، ہر کہ شد بجہاں شہریار یافت

فرمانروائے ماست کہ از فرِ شوکتش — شد تاج سرفراز و نگیں اعتبار یافت

مقطع ہے:

از بس مراست جیبِ مسمیٰ ز نقدِ اسم — ہر جا الف نبشت، محاسب ہزار یافت

پہلے مصرعِ اولیٰ یوں تھا:

تقدیر کار و بارِ مسمیٰ باسم داد

(۲) قصیدہ نمبر ۲۱

کلیاتِ مطبوعہ میں اس کا عنوان ہے : ہم در مدحِ شہنشاہ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ بھی ملکہ وکٹوریہ ہی کی مدح میں ہے۔ علی گڑھ کے نسخے میں اس کے عنوان میں فقط ایک لفظ ہے : ایضاً، اور اس سے پیشتر کے قصیدے کا عنوان ہے : در تہنیتِ نوروز۔ اس سے ثابت ہوا کہ اولاً یہ قصیدہ بھی تہنیتِ نوروز ہی میں لکھا گیا تھا۔ اس میں یہ تین شعر ملتے ہیں :

کلکۂ بے خزاں ز روے حقیقت — بزمِ ولی عہد کیقباد فر آمد
خامہ رقم زد بنامہ مطلعِ دیگر — تا سخن از فتحِ ملک و نو ظفر آمد

شاہ ولی عہد میں بکہ گر آمد
فتح بمعنئ مرادفِ ظفر آمد

بہادر شاہ ظفر کے ایک بیٹے میرزا اعلام فخر الدین عرف میرزا فخرو تھے، جو ان کے سب سے بڑے بیٹے میرزا دلدار بخت کی وفات کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولی عہد تسلیم کیے گئے تھے، ان کا خطاب فتح الملک تھا۔ ان اشعار سے معلوم ہوا کہ میرزا نے یہ قصیدہ نوروز کی تقریب پر انھیں کی ستائش میں لکھا تھا۔ پورے قصیدے میں ان تین شعروں کے علاوہ اور کوئی ایسا مقام نہیں، جہاں سے ممدوح کی شخصیت ظاہر ہوتی ہو۔ چنانچہ غالب نے پہلے دو شعروں میں مناسب لفظی تغیر کیا جس سے ولی عہد کی شخصیت غائب ہو گئی اور مطلع کی جگہ نیا مطلع لکھا۔ اب یہ تینوں شعر یوں چھپے ہیں :

کلکۂ بے خزاں ز روے حقیقت — بزمِ شہنشہ کیقباد فر آمد
خامہ رقم زد بنامہ مطلعِ دیگر — تا سخن از فتح و نصرت و ظفر آمد

نامہ ز وکٹوریہ چو نامور آمد
از افقِ نامہ آفتاب بر آمد

(۳) قصیدہ نمبر ۳۵

اس قصیدے کا مطلع ہے :

یافت آئینۂ بختِ تو ز دولت پرداز — کہ کلکتہ ! بدیں حسن خدا داد بناز

اور بیتِ اسم ہے:

چارلس مٹکف فرخندہ شمائل کہ بدہر   بستہ بر دامن نظارہ زفردوس طراز

اس وقت کلیات میں اس قصیدے پر کوئی عنوان نہیں، لیکن طبع اول (۱۸۴۵ء) میں یہ عنوان ملتا ہے: درستایشِ سر چارلس تھیا فلس مٹکف صاحب بہادر (SIR CHARLES THEOPHILUS METCALFE) سر چارلس مٹکف ۱۸۳۴ء میں وائسرائے اور گورنر جنرل کلکتہ کی کونسل کے نائب صدر (وائس پریذیڈنٹ) مقرر ہوئے تھے، اور یہ قصیدہ اسی زمانے میں ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اسی لیے بانکی پور کے دونوں قلمی نسخوں میں اس کا عنوان ہے:

باندازِ تہنیت احرازِ پایہ دلیس پرسیڈنسی شورِ مدح سر چارلس مٹکف بہادر انگیختن۔

لیکن یہ قصیدہ بھی اس سے پہلے سر چارلس ہی کے ایک دوسرے ہم وطن مسٹر (بعدہ سر) فرانس ہاکنس (FRANCIS HAWKINS) کی مدح میں تھا۔ غالب کے فارسی مکتوبات کا ایک مجموعہ[۲] قومی دفتر خانہ ہند، نئی دلی میں ہے اس کے بیشتر خطوط غالب نے سفر کلکتہ اور وہاں کے قیام کے دوران (۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ء) میں مولوی محمد علی خان، صدر امین، باندا کے نام لکھے تھے۔ ان میں یہ قصیدہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہاکنس کی مدح میں تھا۔

ہاکنس دِلی ریذیڈنسی میں ریذیڈنٹ سر ایڈورڈ کولبروک (EDWARD COLBROOK) کا نائب تھا جب غالب نے اپنی پنشن کا مقدمہ کلکتے میں دائر کیا ہے (۱۸۲۸ء)، تو انھیں حکم ملا کہ یہ مقدمہ انگریز ریذیڈنٹ دلی کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ چنانچہ غالب نے کلکتے سے اپنے دوستوں کو خط لکھے اور مختار نامہ بھیج کر مقدمہ یہاں کولبروک کے سامنے پیش کروا دیا۔ کولبروک نے اس پر جو رپورٹ کی، وہ بہت حد تک غالب کے حق میں تھی۔ لیکن اس کے تھوڑے ہی دن بعد کولبروک ایک رشوت کے تعدے میں معزول ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا نائب ہاکنس قائم مقام ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔ غالب کی کلکتے سے واپسی تک ہاکنس اس عہدے پر متمکن تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ اسی مرحلے پر یہ قصیدہ غالب نے ہاکنس کے خوش کرنے کو لکھا ہوگا۔ ہاکنس فارسی اچھی خاصی جانتا تھا۔ لیکن غالب کی شامتِ اعمال، ہاکنس نے فریقِ مخالف نواب

۲۔ جناب اکبر علی   ترمذی نے ان خطوط کو مرتب کر کے بعنوان نامہای فارسی غالب شائع کر دیا ہے (دہلی ۱۹۶۹ء)

شمس الدین احمد خان سے رشتۂ دوستی استوار رکھا اور صدر میں غالب کے خلاف رپورٹ لکھ بھیجی۔ اس پر غالب نے ہاکنس کے خلاف ایک قطعہ لکھا[۵] اور یہ قصیدہ بھی بعد کو سر چارلس مٹکف کے نام کر دیا۔

(۴) قصیدہ نمبر ۴۱

یہ قصیدہ جان رسل کالون (JOHN RUSSEL COLVIN) کی مدح میں ہے اور اس کا مطلع ہے:

تیز تا بنگری بشاخ نہال طوطیان زمردیں تمثال

جب نواب شمس الدین احمد خان کے خلاف ولیم فریزر کے قتل کا مقدمہ چلا ہے، تو اس کی سماعت انھی کالون نے کی تھی۔ یہ بعد کو غرب و شمال (یو۔ پی) کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہو گئے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں ان کا آگرے میں انتقال ہوا۔

گمان غالب ہے کہ یہ قصیدہ ان کی خدمت میں ان کی لفٹنٹ گورنری کے زمانے میں پیش ہوا ہوگا۔ لیکن پہلے یہ قصیدہ بھی ان کی مدح میں نہ تھا۔ اس کی بیت اسم ہے:

اسکوئر[۶] کالون کہ درگاہش اہل دل راست کعبۂ آمال

نواب علائی والے نسخے میں پہلا مصرع تبدیل کیا گیا ہے۔ پہلے کچھ اور تھا، اسے چھیل کر خود غالب نے اس کے اوپر یہ مصرع لکھا ہے۔ لہٰذا پیچھے کا مصرع پڑھا نہیں جاتا۔ دوسرے مصرع کے تیور کچھ ایسے ہیں کہ اگر یہ بھی دراصل بہادر شاہ ظفر ہی کی مدح میں ہو، تو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ پورے قصیدے میں اس مصرع کے علاوہ صرف ایک جگہ اور تبدیلی ہوئی ہے۔ شعر ہے:

سرو با من ہمی دَوَد با جفت تا کرامی روم باستقبال

مخطوطے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرع ثانی پہلے کچھ اور تھا؛ موجودہ مصرع اسی کے اوپر لکھا گیا ہے۔

۵۔ کلیات فارسی (نظم) قطعہ نمبر ۱۵

۶۔ ESQUIRE

(۵) قصیدہ نمبر ۴۳

اس قصیدے کا مطلع ہے:

باز پیغام بہار آورد باد | مژدہ، ہر روز گار آورد باد

اور اس کے ممدوح ہیں حکومتِ ہند کے سابق سکرٹری جناب سر جارج فریڈرک اڈمنسٹن SIR GEORGE FREDERICK EDMONSTONE یہ بھی بعد کو صوبۂ مغرب و شمال (یو۔ پی) کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے۔ بیت اسم ہے:

والیِ غرب و شمال اڈمنسٹن | بردے ایماں بندہ وار آورد باد

مقطع میں بھی ممدوح کا نام آیا ہے:

شاد باد اڈمنسٹن کز بہر او | خواہد اینہا بار بار آورد باد

یہ قصیدہ بھی اولاً بہادر شاہ ظفر کی مدح میں تھا۔ علی گڑھ والے مخطوطے میں اس کا عنوان ہے: در تہنیت نوروز۔ نواب علائی والے نسخے میں عنوان اس سے زیادہ مفصل تھا، لیکن چونکہ اسے چھیل دیا گیا ہے اس لیے اس کے درمیان کے چند الفاظ پڑھے نہیں جا سکے۔ اس کے باوجود اتنی عبارت آسانی سے پڑھی جاتی ہے "در تہنیت نوروز۔۔۔ ۱۲۷۱ھ" جس سے معلوم ہوا کہ یہ قصیدہ ۱۸۵۵ء میں نوروز کی تقریب پر لکھا گیا تھا۔

کلیات مطبوعہ کے ص ۲۹۴ پر شعر ہے:

از غم پائیز دنشش بر خداست | تا باد از برگ چنار آورد باد

علی گڑھ مخطوطے میں اس کے بعد یہ شعر ہے، جو مطبوعہ قصیدہ سے خارج کر دیا گیا:

گرد رنگیں خاست بر چرخ از شفق | تا چہا از روزگار آورد باد

کلیات کے اسی صفحہ پر شعر ہے:

در الٰہ آباد چوں بازار گاں | تحفہ از ہر دیار آورد باد

اولاً الٰہ آباد کی جگہ جہاں آباد تھا، جو شاہجہاں آباد کا مخفف ہے۔

پھر شعر ہے:

کے بہ نذر شہریار آرزو ہمی | ایں ہمہ بہر نثار آورد باد

مطبوعہ کلیات میں اس کے بعد مندرجۂ صدر بیتِ اسم ہے، لیکن علی گڑھ والے مخطوطے میں یہاں یہ دس شعر زائد ہیں:

نامدارِ مشتری انگشتری — بر ز وے ایماں بندہ دار آورد باد
آں ہمایوں تختِ کش بر قفے بدوش — باز بہرِ تاجدار آورد باد
واں درفشِ کاویانی را ز پارس — جانبِ دہلی دیار آورد باد
از رُخِ من کز غمِ ہجر است زرد — برگ ریز اندر بہار آورد باد
بخیۂ زخمِ دلم را بامداد — تارے از گیسوے یار آورد باد
زخم را با مشک نتواں دوختن — یارب! ایں بہر چہ کار آورد باد
سوے بزمِ شہ کہ رنگیں گلشن است — ہمچو آبم بے قرار آورد باد
شاہ گفتم باد را تحسیں کند — کایں چنیں کامل عیار آورد باد
چوں عیارِ شہ گرفتم در کمال — زاں غرورم شرمسار آورد باد
مست خیزد ہر دم از بزم مرا — مست بر گردد ہوشیار آورد باد

کلیات میں کا بیت اسم تو ظاہر ہے کہ اصلی قصیدے میں کیوں ہوتا، لیکن اس کے بعد کے سولہ شعر بھی اس میں نہیں ملتے۔ یہ خاص نئے ممدوح کے لیے لکھے گئے تھے۔

مقطع اوپر لکھ چکا ہوں:

شاد باد اڈمنسٹن کز بہرِ او — خواہد اینہا بار بار آورد باد

پہلے مصرع اولیٰ تھا: شاہ بادا در جہاں کز بہر شاہ

(۶) قصیدہ نمبر ۴۹

مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم — ہوسِ زلف ترا سلسلہ جنباں رفتم

اس قصیدے کی زمین اور اس کے متعدد شعر دلیلِ قاطعہ تھے کہ اسے غالب نے سفرِ کلکتہ کے اثنا میں لکھا تھا اور ان کا ارادہ اسے شاہِ اودھ غازی الدین حیدر اور ان کے دستورِ اعلیٰ معتمد الدولہ آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کا تھا۔ میرزا نے خود لکھا

ہے۔ کہ جب آغا میر سے ملاقات کی بات چلی، تو میری طبیعت قصیدہ لکھنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اس لیے میں نے صنعت تعطیل میں ایک مختصر سی فارسی نثر لکھ لی۔ (جو اس وقت بھی ان کے کلیات نثر میں موجود ہے) اس سے یہی قیاس کیا گیا کہ اگرچہ یہ قصیدہ انھوں نے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن وہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے کہ آغا میر کی طرف سے ملاقات کے لیے سلسلہ جنبانی شروع ہوئی لہٰذا مجبوراً انھوں نے عجلت میں نشائیہ نثر لکھ لی۔

غالب کے فارسی مکتوبات کے جس مجموعے کی طرف صدر میں اشارہ ہو چکا ہے، اس کے بعض خطوں سے اس قصیدے پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

کلیات مطبوعہ میں اس قصیدے کے ممدوح نصیر الدین حیدر، شاہِ اودھ اور ان کا وزیر روشن الدولہ ہیں، جیسا کہ مندرجۂ ذیل دو شعروں سے معلوم ہوگا:

ہم زا سمت کہ دہد نصرتِ دینِ حیدر — صفتِ ذاتِ تو دانستم و نازاں فتم
روشن الدولہ بہادر کہ باشیا روعطا — حاتمش گفتم و شرمندۂ نقصاں فتم

اس قصیدے سے متعلق غالب لکھتے ہیں[9]:

قصیدہ کہ در مدح آغا میر گفتہ ام۔ خدا می داند کہ برا ے خاندان من
کُفر و داغِ بدنامی ست و لطف ایں کہ آں یک صد و دہ شعر را از صفحۂ
حک ساختن نمی توانم۔۔۔ چون نواب مرشد آباد نیز سید زادہ است
ایں قصیدہ را بنامِ وے شہرت دہم، گو بصلۂ متش نارسیدہ۔۔۔۔
لیکن مداح بودنِ من ہمایوں جاہ را برمن ناگوار نیست، توقع کہ تا
زمانیکہ اشعارِ موضح اسمِ ممدوح را۔۔۔۔ آں قصیدہ را بحش نمایند
وعیب خرداں را چوں بزرگاں بپوشند

اس سے معلوم ہوا کہ

(۱) اصلی قصیدے کی مکمل نقل مکتوب الیہ مولوی محمد علی خان کے پاس تھی۔ یہ خود غالب ہی

۷۔ کلیات نثر غالب (نولکشور ۱۸۸۴ء): ۶۵ ۸۔ ایضاً: ۶۵۔ ۶۶
۹۔ ناجہای فارسی غالب: ۲۹ ۱۰۔ اس سے مراد والی مرشد آباد ہیں۔

نے انھیں اپنے قیام باندا کے دوران میں دی ہوگی [11]

(۲) قصیدہ اولاً واقعی غازی الدین حیدر اور معتمد الدولہ آغا میر کی مدح میں تھا، اور باندہ کے قیام تک مکمل ہو چکا تھا۔

(۳) اگر شعروں کی تعداد انھوں نے تخمیناً نہیں لکھی تو یہ (۱۱۰) تھے۔ اس وقت کلیات میں (۱۰۴) شعر ملتے ہیں، گویا چھ کم۔

(۴) غالب، آغا میر سے اس حد تک ناراض تھے کہ انھیں یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ان کی اس کے مدّاح کی حیثیت سے شہرت ہو اور وہ اسے اپنے خاندان کے لیے توہین و ہتک کا باعث خیال کرتے تھے۔

(۵) ان کا ارادہ تھا کہ مناسب ردّ و بدل کے بعد اس قصیدے کو ہمایوں جاہ نواب مرشد آباد کے نام منسوب کردیں۔ غالباً اس کی مناسب تقریب پیدا نہ ہوئی اور انھوں نے کچھ مدت بعد اسے اصلی ممدوحین کے بجائے ان کے جانشینوں — نصیر الدین حیدر اور نواب روشن الدولہ کے نام منتقل کر دیا"۔

رہی یہ بات، کہ اگر قصیدہ مکمل ہو چکا تھا اور انھوں نے اسے لکھا بھی غازی الدین حیدر اور آغا میر ہی کے لیے تھا، تو آغا میر سے ملاقات کے وقت تازہ نثر لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس کی ایک ہی توجیہ خیال میں آتی ہے۔ قصیدہ انھوں نے بنیادی طور پر غازی الدین حیدر ہی کی مدح میں لکھا تھا۔ معتمد الدولہ آغا میر کا نام تو اس میں طفیلی طور پر اس کے نائب کی حیثیت سے آگیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے پہلی ملاقات ہی میں آغا میر کی خدمت میں کیونکر پیش کر سکتے تھے؛ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے صنعتِ تعطیل میں نثر لکھ لی۔ اگر یہ ملاقات خوش اسلوبی سے سرانجام ہو جاتی، تو اس کے بعد وہ، یقیناً آغا میر سے درخواست کرتے کہ پادشاہ کے حضور میں میری باریابی کا انتظام کیا جائے۔ وہ یہ قصیدہ اس موقع پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس مرحلے پر ضمناً آغا میر کی مدح بھی ٹھیک تھی کہ آخر وہ وزیر اعظم

۱۱۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب موصوف کا مضمون "غالب کے ایک قصیدے کا اوّلین ممدوح" مطبوعہ "صبح" (حصہ ۱) دہلی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

تھے۔ ورنہ بادشاہ کی مدح کا قصیدہ اس کے نائب کے پیش کرنا کسی صورت میں بھی مناسب نہیں تھا۔

بدقسمتی سے بسم اللہ ہی غلط ہوئی اور سرے سے آغا میر ہی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پس یہ قصیدہ کہیں پیش نہ کیا جا سکا۔ افسوس کہ اس قصیدے کی کوئی ابتدائی شکل دستیاب نہیں ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کیا کیا تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

(۷) قصیدہ نمبر ۵۲

غالب، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں[۱۲]:

> جہاں پناہ[۱۳] کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا۔ میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا انوریؔ نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا! اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں کہ جس کا ذکر بطریق اختصار اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدہ سے مجھے عرضِ دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔

کلیات میں جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، واجد علی شاہ کی مدح میں تین قصیدے ملتے ہیں۔ ۵۱، ۵۲، ۵۳۔ میرا خیال ہے کہ یہاں قصیدہ (۵۲) کی طرف اشارہ ہے۔ قصیدہ (۵۱) بہت قدیم ہے اور تمام مخطوطات کے ابتدائی حصے میں پایا جاتا ہے۔ قصیدہ (۵۳) کا مطلع ہے:

بیا در کربلا، تا آں ستم کش کاروان بینی — کہ در صحرے آدم آلِ عبا را ساربان بینی

اس کا عنوان علی گڑھ کے مخطوطے میں "در مدحِ ضریحِ مبارک" ہے اور اس میں مجتہد العصر سید محمد کی مدح میں بھی چند شعر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ قصیدہ واقعی واجد علی شاہ ہی کے عہد میں لکھا گیا تھا۔

۱۲۔ اردوئے معلی (مطبع کریمی، لاہور۔ ۱۹۲۲ء): ۲۵۶

۱۳۔ واجد علی شاہ، جو ان دنوں معزول ہو کر کلکتے میں مقیم تھے۔ مکتوب الیہ بھی وہیں تھا۔

تیسرا قصیدہ (۵۲) جس کا مطلع ہے:

رواست شور نشیدہ و ترانہ مستاں را   بشرط آں کہ نگو یند راز پنہاں را

یہ بالعموم مخطوطات کے آخر میں ملتا ہے اور میرے خیال میں غالباً یہی وہ قصیدہ ہے، جو پہلے امجد علی شاہ کے لیے کہا گیا تھا اور جس میں واجد علی شاہ کا نام لکھ کر انھوں نے بیٹے کے حضور میں پیش کر دیا۔ چونکہ دونوں نام رباعی ہم وزن ہیں، اس لیے نام تبدیل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی تھی؛ دونوں بادشاہ تھے، اس لیے باقی قصیدے میں بھی کسی ردّ و بدل کی ضرورت نہیں ہوئی۔

(۸) قصیدہ نمبر ۷۵

اس قصیدے کا مطلع ہے:

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را   وے بر شرف ذات تو اجماع امم را

کسی بیت میں ممدوح کا نام نہیں، لیکن قصیدے کے چوتھے شعر میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی معذرت کی ہے کہ ممدوح کا پورا نام اس بحر میں لکھا نہیں جا سکتا۔ لکھتے ہیں:

حقا کہ ز اسم تو عیانست کہ در شرع   فرزانہ وزیرے شہ بطحا و حرم را

معذورم اگر نام تو در بحر نگنجد   در کوزہ چساں جائے دہم دجلہ و یم را

یہ "وزیر"، نواب وزیر الدولہ وزیر علی خاں بہادر والیِ ٹونک ہیں لیکن یہ قصیدہ بھی پہلے کسی اور کے نام تھا۔ بانکی پور کے نسخے میں اس کا خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا عنوان ہے:

"روشن گری آیینۂ سخن بہ چشم داشت قبول از شمس الامرا نواب محمد رفیع الدین خان بہادر نائب والیِ حیدر آباد۔"

اس قصیدے کے پیچھے ایک داستان ہے۔

دلّی میں ایک شخص آیا۔ یہ صاحب پہلے کہیں حیدر آباد میں تھے اور خدا معلوم، انھوں نے وہاں کے علمی حلقوں میں اپنے متعلق کیا کیا دُون کی لی ہوگی۔ اس طرح کے آدمی اپنا اثر و رسوخ جتانے کو عموماً بعض بڑے بڑے لوگوں کے نام لے دیا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عرب و عجم

سے کوئی بزرگوار آجائیں تو ان کی جو خاطر مدارات اور قدر و منزلت ہوتی ہے، یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ عربی وہ لازماً بولینگے ہی، کیونکہ اُن کی مادری زبان ہے۔ اب عربی ٹھہری ہمارے مذہب اور قرآن کی زبان؛ بس ہمارے خوش فہموں اور ضعیف الاعتقادوں کو اور کیا چاہیے! اگر وہ ذرا چرب زبان بھی ہوئے (اور اس قماش کے لوگ عموماً چرب زبان ہوتے ہیں)، تو ان کا نام مولانا فلاں اور علامۂ زماں ہو جائیگا، اور وہ کسی نہ کسی خانوادۂ بزرگ سے منسوب کر دیے جائینگے۔ اور پھر اس کے بعد "مریداں می پرانند" کا مضمون مکمل ہو جائیگا۔

تو خیر، یہ صاحب دلّی جو آئے، تو یہاں غالب سے ملے۔ انھوں نے اپنی، اور اپنے حیدرآباد کے حلقۂ احباب کی اہمیت جتانے کو افسانہ تراشا کہ میں نواب شمس الامراء وزیر سلطنت کی مجلس میں تھا، وہاں آپ کا ذکرِ خیر ہو رہا تھا۔ دیوانہ را ہوئے بس است، غالب بیچارے کو ہمیشہ قدر دانوں کی کمی کا رونا رہا۔ انھوں نے جو سنا کہ شمس الامرا کی مجلس میں میرا ذکر ہو رہا تھا، تو قدرتاً بہت خوش ہوئے۔ قصیدہ لکھا اور ایک خط کے ساتھ نواب صاحب موصوف کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ خط ملاحظہ ہو[14] (طوالت معاف)

. . . . . یزدانِ فیروزی بخش توانائی دہ را سپاس کہ با ایں ہمہ دوری مہجور نیست؛ و اگر خود را از نزدیکاں شمارد، دور نیست۔ برہان دعویٔ ایں کہ مخدوم و مطاعِ محمدیانِ آفاق مولانا عبدالرزاق کہ شریف مدینہ و صورتِ صدق و صفا را آئینہ اند، اگزشتن ذکرِ خاکسار بزمِ جاوید بہار ذکر کردہ اند، ہمہ دانی و فیض ربانی نواب خدایگانی با غائب و حاضر و دور و نزدیک یکساں است۔ . . . . در ایں سپیدہ دم کہ بختِ غنودہ بچشم نیم باز در من نگریست و بلبل طبع بتقاضائے زمزمہ بال فرو گرفت، خدارا ایمائش خداوند را ستائش ساز دادہ آمد۔ بستنِ دل و در لوامع سحری و رسے برُوئے دل کشود، تا در آں روشنی قصیدۂ مشتمل بر شصت و ہفت بیت پیوند نگارش پذیرفت۔ . . . . فرخا بختِ عریضہ نگار کہ بدستیاریٔ چشمداشت قبول روزبے چند دل بشادمانی نہد و در ایں تنہائی دادِ ہمدمی خویش دہد۔ فرد۔

۱۴۔ کلیات نثر غالب: ۱۹۲-۱۹۳

بالتفات بزمِ در آرزو چہ نزاع　　نشاطِ خاطرِ مفلس زکیمیا طلبی است

چنانکہ ہوس می سنجد آز می سگالد، اگر بندہ بر در را دل بپرسش گرم نگردد، دمڑہ از مہر نم ندہد، پندارم، آں آہ نیم سوختہ را شعلہ فرد مرد و آں گیاہ دو دانہ دو را باد ببرد۔ آرے مدح سرائی است، نہ معرکہ آرائی، عرض بندگیست نہ لاف بر ازندگی، بکار بانجت کارساز است، نہ بازبانِ دراز، ذریعۂ سائل دعائے دولت است، نہ دعوئ خدمت۔ قصیدہ:

اے مظہرِ کل در ازل آثار کرم را　　منت بسرِ لوح ز اسمِ تو قلم را

شمس الامرا کز شرفِ نسبت نامش　　خور قبلۂ بداو رنگ نشینانِ عجم را

عبدالرزاق نے تو یونہی گپ ہانکی تھی؛ ممکن ہے، وہاں کسی نے غالب کا نام بھی نہ سُنا ہو۔ چنانچہ ستایش کا صلہ آیا، نہ خط کی رسید۔ لہٰذا انھوں نے موقع آنے پر اسے نواب وزیرالدولہ کے نام منسوب کر دیا اتنا اور کیا کہ آغاز کے دونوں شعر جو محولۂ فوق خط میں آئے ہیں، حذف کر دیے اور ان کی جگہ پانچ نئے شعر لکھے۔ خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ قصیدہ (۶۷) اشعار پر مشتمل ہے، چنانچہ قلمی نسخے میں اتنے ہی شعر ہیں، لیکن اس حذف و اضافہ کی وجہ سے اب اس میں (۷۰) شعر ملتے ہیں۔

موجودہ قصیدے میں ایک شعر ہے:

در بزمِ تو گویند، سخن می رود از من　　از بلبل شیدا کہ خبر کرد ارم را

یہ وہی بات ہے، جو انھوں نے نواب شمس الامرا کے خط میں بھی لکھی ہے کہ مولانا عبدالرزاق نے بتایا کہ میرا ذکر آپ کی محفل میں ہوتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ نواب وزیرالدولہ کی مجلس میں ان کا ذکر کیوں ہوگا! یہاں شعر بے محل ہے؛ ظاہرا وہ اسے حذف کرنا بھول گئے۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس قصیدے کا انتساب "شمس الامرا نواب محمد رفیع الدین خان بہادر نائبِ والیِ حیدرآباد" سے بھی غلط ہے۔

حیدرآباد میں "شمس الامرا" پانچ امرا کا خطاب رہا ہے۔ نواب ابوالفتح خان شمس الامرا اوّل تھے۔ شمس الامرا دوم ان کے صاحبزادے نواب فخرالدین خان ہوئے۔ اس قصیدے

کے ممدوح نواب محمد رفیع الدین خان شمس الامرا سوم، نواب فخرالدین خان کے سب کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے بعد دو اور صاحب اس خطاب کے حامل ہوئے۔ شمس الامرا چہارم نواب رشید الدین خان تھے۔ یہ سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے شمس الامرا دوم نواب فخرالدین خان کے (دوسرے لفظوں میں یہ نواب محمد رفیع الدین خان شمس الامرا سوم کے چھوٹے بھائی تھے) آخری صاحب رشید الدین خان کے فرزندِ ارجمند نواب محی الدین خان شمس الامرا پنجم تھے۔ ان کے بعد یہ خطاب کسی کو نہیں ملا۔

بانکی پور (پٹنہ) کے اس مخطوطے کی، جس میں اس قصیدے کے عنوان میں خود غالب نے ممدوح کا نام شمس الامرا نواب محمد رفیع الدین خان بہادر لکھا ہے، کتابت ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۵۷ھ (۲۹ دسمبر ۱۸۴۱ء) کو ختم ہوئی تھی۔ نواب محمد رفیع الدین خان کو شمس الامرائی کا خطاب اپنے والد نواب فخرالدین خان شمس الامرا دوم کی وفات کے بعد کہیں ۱۲۷۹ھ میں ملا۔ پس ۱۲۵۷ھ (تاریخ کتابت مخطوطہ) سے پہلے انھیں اس خطاب سے مخاطب کرنا اور "نائب والی حیدر آباد" لکھنا کیونکر درست ہو سکتا ہے!

حقیقت وہی ہے، جو عرض کر چکا ہوں کہ "مولانا شریف مدینہ" نے غلط بیانی کی۔ وہ نواب شمس الامرا کی مجلس میں کبھی گئے ہی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی اہمیت جتانے کو غالب سے کہہ دیا کہ وہاں آپ کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نام تک غلط بتا دیا (اگرچہ اس کا امکان ہے کہ بیٹے کا نام انھوں نے کسی سے سُنا ہو یا شاید اس کی مجلس میں کبھی حاضری دی ہو) لیکن غالب کے پاس تصدیق کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا! کالے کوسوں کا سفر، وہ کس سے دریافت کرتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ خط اور قصیدہ ہی لکھ سکتے تھے۔ یہی انھوں نے کیا، لیکن وہاں کوئی بات ہوئی ہوتی، تو جواب آتا۔ چنانچہ صدا برنخاست۔

(۹) قصیدہ نمبر ۵۷

یہ دوسرا قصیدہ ہے جو کلیات میں نواب وزیر الدولہ وزیر علی خان بہادر والیِ ٹونک کی مدح میں ملتا ہے، اس کا مطلع ہے:

عیدِ اضحیٰ بہ سرِ آغازِ زمستاں آمد   وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد

مولانا حالی نے اس مطلعے سے متعلق روایت کی[۱۵] ہے کہ پہلے اس میں "عیدِ قرباں" تھا۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے سُنا، تو کہا کہ اس سے "عیدِ اضحیٰ" بہتر رہیگا۔ اس پر غالب نے اسے تبدیل کر دیا۔

قصیدے میں ممدوح کا نام اس بیت میں آیا ہے:

صورتِ معنیِ اسلام وزیرالدولہ   کہ دلش آئینۂ صورتِ ایماں آمد

یہی وہ قصیدہ ہے، جس کا صلہ نہ ملنے پر انھوں نے ایک قطعہ لکھا تھا کہ میں نے "خِرد" سے پوچھا کہ میں نے نواب صاحب کی خدمت میں قصیدہ بھیجا تھا، انھوں نے جواب تک نہ دیا۔ "خِرد" نے کہا، حضرت! آپ کو شیطان بہکا رہا ہے؛ شُبہے کو دل میں راہ نہ دیجیے۔ نواب صاحب تحفۂ ارمغاں کی فکر میں ہیں اور اس کے لیے دیار و امصار سے طرح طرح کا سامان جمع ہو رہا ہے۔ دمشق سے دیبا اور روم سے مخمل؛ دکن سے ہاتھی اور عراق سے گھوڑے؛ نیشاپور سے فیروزہ اور بدخشاں سے یاقوت وغیرہ۔ اب جب تک یہ تمام ساز و سامان جمع نہ ہو لے، وہ تمھارے خط کا جواب کیسے دیں اور قصیدے کا صلہ کیونکر روانہ کریں! تاخیر کا بس یہی سبب ہے، تمھیں اس تاخیر سے رنج و ملال نہیں ہونا چاہیے۔

یہ قصیدہ علی گڑھ کے مخطوطے میں موجود ہے اور وہاں اس کا عنوان ہے: در تہنیتِ عیدِ قرباں[۱۶]۔ اس سے پیشتر کے دو قصیدوں کے عنوان ملاحظہ ہوں:

(۱) دوش در عالمِ معنی کہ ز صورت بالاست
عقلِ فعّال سراپردہ زد و بزم آراست   در تہنیتِ جشنِ نوروزی (مدح بہادر شاہ ظفر)

(۲) عید است و نشاط و طرب و زمزمہ عام است
می نوش، گنہ بر من، اگر بادہ حرام است   در تہنیتِ عیدِ رمضان (مدح بہادر شاہ ظفر)

(۳) عیدِ اضحیٰ بہ سرِ آغازِ زمستاں آمد
وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد   در تہنیتِ عیدِ قرباں (مدح وزیرالدولہ)

۱۵- یادگارِ غالب (مسلم یونیورسٹی پریس): ۷۹   ۱۶- سبدِ چین (مکتبۂ جامعہ، دلی ۱۹۳۸ء): ۲۶-۲۷

اسی سے مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ بھی اولاً بہادر شاہ کی مدح میں تھا، جو عیدالاضحیہ کے موقع پر پیش ہوا اور بعد کو نواب وزیرالدولہ کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

(۱۰) قصیدہ نمبر ۵۸

یہ قصیدہ راؤ راجہ شودھیان سنگھ بہادر والیِ الور کی مدح میں ہے اور تشبیب کے بغیر براہِ راست بیتِ اسم سے آغاز ہوتا ہے ؎

گرد آورد بہ شکلِ فرس بادِ راہوار   تا شودھیان سنگھ بہادر شود سوار
فرزانہ راؤ راجہ کہ بار لے روشنش   کس آفتاب را نبرد نام زینہار
بر ہر زمیں کہ موکبِ عزمش گزر کند   آں جادہ نجتیانِ فلک را بود جہار

علی گڑھ کے نسخے میں اس کا عنوان ہے: در قدومِ نواب گورنر جنرل ہارڈنگ بہادر دام اقبالہٗ جس سے عیاں ہے کہ یہ لارڈ ہارڈنگ کے کلکتے سے دلّی آنے کے موقع پر لکھا گیا تھا۔ مندرجۂ بالا تینوں ابتدائی شعر مخطوطے میں نہیں اور ان کی جگہ وہاں حسبِ ذیل دو شعر ملتے ہیں:

شادم کہ گردِ موکبِ نوابِ نامدار   گردید کُحلِ بینشِ اعیانِ ایں دیار
فرزانہ ہارڈنگ کہ در دفترِ قضا   القابِ اوست داورِ فرزانگی شعار

کلیات (ص ۳۳۵) پر یہ شعر ملتا ہے:

دلہا شکستہ، در تنِ گرداں ز دُور باش   خُونہا فسردہ، در رگِ شاہاں ز گیر و دار

مخطوطے میں اس کے بعد یہ پانچ شعر زائد ملتے ہیں، جو کلیات سے خارج کر دیے گئے:

دستے بملک گیری و دستے بدلبری   صد تیغ در یمین و دو صد گنج در یسار
داور مگوے، خسرو و سلطان و بادشاہ   داور مگوے، قیصر و خاقان و شہریار
ہم در سپہ بکوششِ گردانِ نامجوے   ہم در کلہ بنازشِ شاہانِ نامدار
با فرِّ خسروانی و فرمانِ خسروی   بر خود نہادہ نامِ امیری ز انکسار
آرے روا بود کہ بگفتنِ جہانیاں   خرشید را ستارہ شمارند در شمار

شعر ہے:

چوں من گہر فروش نباشد بہر دیار   چوں من سخن سرائے نخیزد ز ہر دیار

اس کے بعد کے گیارہ شعروں میں سے ایک بھی قلمی نسخے میں نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب نئے ممدوح کے لیے لکھے گئے تھے۔ ان میں انھوں نے الور سے اپنے خاندان کے پرانے تعلقات اور اپنے والد کی اسی ریاست کی ملازمت میں وفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کلیات میں چھپا ہے:

در سینہ خوں شدہ دز فرو ریختہ ز چشم   گر دل بہ بخشش تو نبودے امیدوار

قلمی نسخے میں "در سینہ" کی جگہ "از غصہ" ہے اور اس کے بعد کے دونوں شعر بھی وہاں نہیں ملتے۔

کلیات میں شعر ہے:

پاداشِ جاں گدازیِ من در طریقِ نظم   دستے بدست گیریِ من زآستیں برآر

یہ شعر مخطوطے میں اس شکل میں نہیں، اس کی جگہ دو شعر اس طور پر ہیں:

پاداشِ جاں گدازیِ من در طریقِ نظم   رشحے بشادکامیِ من از قلم ببار

جلدوئے کارسازیِ من در رہِ مدح   دستے بدست گیریِ من زآستیں برآر

مجھے شبہ ہے کہ کاتب نے پہلے شعر کا مصرعِ اول لکھنے کے بعد غلطی سے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع لکھ دیا۔ اور یوں ایک شعر غائب ہو گیا۔

(۱۱) قصیدہ نمبر ۵۹

یہ قصیدہ مہاراجہ نرندر سنگھ والی پٹیالہ کی مدح میں ہے۔ اس کا مطلع ہے:

سحر گاہ بادِ سحر عرض بوستاں گیرد   دہد بہ نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد

اس قصیدے کا عنوان دونوں لوہارو اور علی گڑھ کے نسخوں میں یوں ہے: "در مدح حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ سلطنتہ"۔ البتہ لوہارو والے نسخے میں اسے مٹانے کی کوشش نمایاں ہے اور بیت اسم کا پہلا مصرع خود غالب نے یوں بنایا ہے:

زبسکہ راجہ سلطاں نشاں نرندر سنگھ

شیفتہ والے نسخے میں یہ مصرع اپنی اصلی شکل میں موجود ہے،

زبسکہ بادشہ بحر و بر بہادر شہ

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد غالب کے مالی حالات بہت تشویشناک صورت اختیار کر گئے تھے۔ انگریزی پنشن موقوف، قلعے کی تنخواہ مسدود، خرچ بدستور بلکہ المضاعف۔ شریف خانی حکیموں کا خاندان ان کا دیوار بدیوار ہمسایہ اور دوست تھی۔ ان لوگوں کے پٹیالہ راج سے ملازمت کے تعلقات تھے۔ انھوں نے کوشش کی کہ غالب پٹیالے چلے جائیں، تاکہ وہاں جاکر انھیں ذرا آرام کا سانس لینا نصیب ہو، قیاس چاہتا ہے کہ غالبؔ نے یہ قصیدہ انھی ایام میں مہاراجہ نرندر سنگھ کے نام کہا ہوگا۔

(۴)

میں نے اوپر گیارہ قصیدوں کی نشان دہی کی ہے جو پہلے کسی اور کی مدح میں تھے اور بعد کو غالبؔ نے ممدوح کا نام تبدیل کرکے انھیں کسی اور سے منسوب کر دیا۔ لیکن بعض الظن اثمؔ کی تنبیہ کے باوجود یہ لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔

غالبؔ کا تعلق دربار شاہی سے بہت لمبے عرصے تک رہا ہے۔ ان کے کلیات میں ایک قصیدہ بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی (اور شاہزادہ سلیم) کی مدح میں ملتا ہے (قصیدہ نمبر ۱۳) اکبر شاہ ثانی کا انتقال ۱۸۳۷ء میں ہوا اور ظفر ان کے جانشین ہوئے۔ دربار شاہی میں خاص تقریبوں سے قطع نظر، عام طور پر تین موقعوں پر قصیدے پیش کیے جاتے تھے ـــــ نوروز، عید الفطر، عید الاضحیٰ۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ضروری نہیں، غالبؔ نے ہمیشہ ان تینوں تقریبوں پر ضرور قصیدہ نذر گزرانا ہو، تاہم یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک جب وہ تاریخ نگاری پر مامور رہے اور بالخصوص ۱۸۵۴ء کے بعد جب وہ ذوق کی وفات پر استاد شاہ بھی مقرر ہو چکے تھے، انھوں نے تینوں تقریبوں پر ضرور قصیدے کہے ہوں گے۔ وہ خود معترف ہیں کہ وظیفہ خواری اور دعاگوئی، لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔

اس وقت کلیات میں صرف بیندرہ قصیدے بہادر شاہ کی مدح میں ملتے ہیں۔ اگر وہ پانچ قصیدے بھی ان میں شامل کر لیے جائیں، جن سے متعلق یقین ہے کہ وہ پہلے انھی

کے نام تھے ، تو بھی سب مل کر بیس ہوتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ انھوں نے بیس سالہ دورِ حکومت اور سات سالہ تاریخ نگاری اور سہ سالہ استادی کے زمانے میں صرف بیس قصیدے ہی بہادر شاہ کی مدح میں لکھے ہوں۔ اور میرزا فتح الملک ولی عہد کی مدح میں لے دے کے سارے تین قصیدے ہیں (۴۶ تا ۴۸) (یا موجودہ قصیدہ نمبر ۳۱ ملا کر چار) حالانکہ میرزا فخرو سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے ۔ وہ بہادر شاہ کے بعد بادشاہ بننے والے تھے ۔ باور نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے انھیں خوش دیکھنے کی کوشش نہ کی ہو اور ان کی مدح میں صرف چار ہی قصیدے لکھے ہوں۔

اسی سے مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ ابھی اور قصیدے بھی ایسے ضرور ہیں، جو پہلے بہادر شاہ اور ان کے ولی عہد کی مدح میں تھے ، اور بعد کو کسی اور کے حوالے کر دیے گئے ۔ میرے نزدیک یہ تمام قصیدے جو اس وقت مختلف انگریزوں کی مدح میں ملتے ہیں ، اسی قبیل سے ہیں ۔

میری نظر میں اس مسئلے کی زیادہ اہمیت اس لیے ہے کہ اگر اصلی قصیدے مہیا ہو جاتے تو ممکن ہے اس طرح ہمیں ان کا کچھ اور کلام دستیاب ہو جاتا ورنہ یوں عام حالات میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فلاں قصیدہ بہادر شاہ کی مدح میں تھا یا وزیر الدولہ کی ۔ نہ مادح رہا نہ ممدوح ؛ ہمیشہ رہے نام اللہ کا ۔

اب آخر میں ایک لطیفہ ملاحظہ فرمایئے :

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے قصیدہ نمبر ۴۹ (روضۂ رضواں رفتم ، سلسلہ جنباں رفتم) سے متعلق لکھا تھا :[۱۷]

> رہی یہ بات کہ غالب نے قیامِ لکھنؤ کی تالیفات میں صرف نثر بہ صنعت تعطیل کا ذکر کیا ہے ، قصیدے کا ذکر نہیں کیا ، نیز ممدوح نصیر الدین حیدر ہے نہ کہ غازی الدین حیدر ، تو اس کی توجیہہ یوں ہو سکتی ہے کہ قصیدہ لکھنے کا

۱۷۔ نقشِ آزاد ، مرتبہ غلام رسول مہر (علمی پرنٹنگ پریس ، لاہور ، طبع ثانی) ۲۸۵ ۔ ۲۸۶

خیال ہوا تھا اور تشبیب کا بڑا حصہ انجام پاگیا تھا، مگر معتمد الدولہ کا حال دیکھ کر طبیعت افسردہ ہوگئی یا پریشانیِ سفر کی وجہ سے تکمیل تک معاملہ نہ پہنچا۔ پھر روشن الدولہ کے زمانے میں مدح کے اشعار بڑھا کر قصیدہ مکمل کر دیا گیا۔

غالب نے قصائد میں اس طرح کی تبدیلیاں اکثر کی ہیں۔

اس آخری فقرے پر مولانا غلام رسول مہر مرحوم حاشیے میں لکھتے ہیں[۱۸]:

کی ضرور ہیں۔ لیکن اکثر نہیں

میں نے اوپر کوئی درجن بھر قصیدوں کی تبدیلی کی نشاندہی کی ہے۔ کیا یہ "اکثر" کے ذیل میں آئینگے یا نہیں؟

۱۸۔ نقش آزاد مرتبہ غلام رسول مہر (علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔ طبع ثانی) ۲۸۵ - ۲۸۶

قادر نامہ کا مصنّف

"خالق باری" اور "آمدنامہ" کی طرز پر ہم معنی فارسی اور اُردو لغات پر مشتمل ایک مختصر منظوم رسالہ "قادر نامہ" کے نام سے مشہور ہے جس کی تصنیف غالب سے منسوب ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے میر افضل علی عرف میرن صاحب کے حالات میں میرن صاحب کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے[1] کہ میرزا غالب نے یہ رسالہ عارف کے دونوں صاحبزادوں باقر علی خان اور حسین علی خان کو فارسی پڑھانے کے لیے لکھا تھا۔ امیر مینائی بھی اپنے تذکرے میں اسے غالب کی تصنیف بتاتے ہیں[2]۔ اس کے باوجود غلام رسول مہر کو رسالے کے غالب کی تصنیف ہونے میں شک[3] ہے۔ انھوں نے اپنے اس نظریے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں پیش کی۔ اور جب تک کوئی ناقابلِ تردید ثبوت سامنے نہ آئے، میرن صاحب اور امیر مینائی کی روایت بہرحال قابلِ ترجیح ہے۔ میرے نزدیک خود قادر نامہ میں بعض ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسالہ واقعی غالب کی تصنیف ہے۔

۱۔ اردو، (۱۹۳۶ء) : ۷۰۵

۲۔ انتخاب یادگار : ۲۴ (مطبوعہ ۱۲۹۷ھ)

۳۔ غالب : ۴۸۳ (تیسرا ایڈیشن)

میرزا نے اپنی فارسی تصنیف "پنج آہنگ" کے آہنگ دوم (زمزمہ چہارم[۴]) میں فارسی کے چند الفاظ دیے ہیں اور ان کی تشریح کرتے ہوئے ساتھ ہی اُردو (ہندی) کے مرادف کلمے لکھے ہیں۔ یہ الفاظ تقریباً سب کے سب پرانی فارسی یعنی پہلوی زبان کے ہیں جو آج کل بالعموم مستعمل نہیں۔ مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مقامات پر قادر نامہ میں بھی یہی الفاظ اسی نہج سے نظم میں درج کر دیے گئے ہیں۔

(۱) قادر نامہ میں ہے:

منھ پر گر جھرّی پڑے آژنگ جان — فارسی چھینکے کی تو آونگ جان

پنج آہنگ میں لکھتے ہیں[۵] "آژنگ شکنی کہ بروے افتد و ہندی جھرّی گویند" اور اس کے معاً بعد ہے:

"آونگ بمعنی ریسمان کہ بسقف آویزند و چھینکا در ہندی خوانند"

(۲) اگلا شعر ہے:

ممّہ آژخ اور چھالا آبلہ — اور ہے دائی جنائی قابلہ

پنج آہنگ میں[۶] ہے:

"آژخ عربی ثوٹول و ہندی ممّہ"

نیز "بازاج و آں را پیش نشیں نیز گویند، ہندی آں دای جنائی"

یہاں دائی جنائی قابل توجہ ہے جو دونوں جگہ استعمال ہوا ہے حالانکہ قابلہ کے لیے صرف دائی کا لفظ کافی تھا اور آمدنامہ میں صرف دائی ہی پر کفایت کی گئی ہے:

اُخت بہن اور اَخ ہے بھائی — مُرضعہ اَنّا قابلہ دائی

(۳) پھر لکھتے ہیں:

اونٹ اشتر اور اُشغر سیّہ ہے — گوشت ہے لحم اور چربی پیہ ہے

---

۴ - کلیاتِ نثر غالب: ۳۵ (نولکشور، کانپور - ۱۲۹۲ھ)

۵ - ایضاً: ۳۶

۶ - ایضاً ۳۶

یہاں اُشغر کا لفظ قابلِ غور ہے۔ پنج آہنگ میں دونوں لفظ ایک ساتھ آگئے ہیں:
"اُشغر بوزنِ اُشتُر اسم جانور یست خار دار کہ بہندی سیہ گفتہ شود"

(۴) قادر نامہ کا شعر ہے:

زندگانی ہے حیات اور مرگ موت — شوی خاوند اور اَنباغ سوت

یہاں انھوں نے سَوت کے لیے انباغ لکھا ہے، جو فارسی نہیں بلکہ ترکی لفظ ہے۔ عربی میں سَوت یا سوکن کے لیے ضُرّہ آتا ہے اور فارسی والے بھی یہی بولتے ہیں۔ چنانچہ آمد نامہ میں سوت کے لیے ضَرّہ لکھا ہے لیکن مرزا نے چونکہ پنج آہنگ میں عربی لفظ سے اجتناب کیا ہے اس لیے وہاں بھی انباغ ہی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

انباغ بمعنیِ دو زن کہ یک شوہر داشتہ باشند و آنرا بہندی سَوت و سَوکن نامند

(۵) قادر نامہ میں لکھتے ہیں:

چکسہ، بُڑیا، کیسہ کا تھیلی ہے نام — فارسی میں دھپتے کا سَیلی ہے نام

پنج آہنگ[۹] "چکسہ بجیم فارسی مفتوح بکاف پیوستہ و سین مفتوح بہا زدہ کاغذے فرو پیچیدہ کہ آنرا بہندی پُڑیا گویند"

سَیلی مرزا کا دل پسند لفظ ہے اور ان کے کلام میں بیسیوں جگہ استعمال ہوا ہے۔

(۶) قادر نامہ:

اَجَل اور آروغ کی ہندی ڈکار — مے شراب اور پینے والا میگسار

۷۔ ایضاً: ۳۷
۸۔ ایضاً: ۳۸
۹۔ ایضاً: ۳۶

پنج آہنگ[۱۰]: اجل بجیم مضموم عربی جُنا دہندی ڈکارو اسم دیگر آروغ"

(۷) قادر نامہ:

ہے قلم کا فارسی میں خامہ نام ہے غزل کا فارسی میں چامہ نام

چامہ غزل کے لیے لکھنا خاص غالب کا انداز ہے۔ انھوں نے یہ پہلوی لفظ اپنی فارسی نثر میں کئی جگہ لکھا ہے اور پنج آہنگ میں بھی متعدد مقامات پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر دستنبو میں تفتہ کے ذکر میں لکھتے ہیں :

آں سپہرِ مہر را ماہِ دو ہفتہ، شیوا زبان ہرگوپال تفتہ کہ مرزا تفتہ مہر
خوانش دادہ ام از میرٹھ سنفتہ[۱۲] زر بمن فرستادہ و چامہ و نامہ پیوستہ می فرستد

قدیم تاریخوں اور تذکروں کے علاوہ کسی اور فارسی مصنف کے ہاں غزل کے لیے چامہ کا لفظ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے ۔

(۸) قادر نامہ:

بھِڑ کی بھائی فارسی زنبور ہے دسپنا اُنبُر ہے اور انبور ہے

پنج آہنگ[۱۳]: اُنبر بہ وزنِ قنبر آلہ ایست کہ آتش بداں کشند و آں را دسپنا نامند اگرچہ دسپنا بھی اصل میں فارسی اور دست پناہ کا مخفف ہے، لیکن فارسی میں اسے آتش گیر کہتے ہیں۔ اُنبر اور انبور دونوں ترکی لغات ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ مرزا نے دونوں جگہ فارسی کی جگہ انبر ہی لکھا ہے

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ پنج آہنگ : ۳۸

۱۲۔ سفنتہ زر یعنی ہنڈی

۱۳۔ پنج آہنگ : ۳۷

(۹) قادر نامہ:

پست اور ستو کو کہتے ہیں سویق ژرف اور گہرے کو کہتے ہیں عمیق

پنج آہنگ[۱۴]: "پست بباے مکسور، عربی سویق و ہندی آں ستو و آں آرد یست بریاں۔

ستو کے لیے سویق فارسی میں عام طور پر مستعمل ہے لیکن مرزا نے یہاں بھی ایک پرانا لفظ ڈھونڈ نکالا اور دونوں جگہ نظم اور نثر میں اردو، فارسی اور عربی تینوں کے لفظ دیے ہیں۔

(۱۰) قادر نامہ:

جس کو کہتے ہیں جمائی فازہ ہے جو ہے انگڑائی وہی خمیازہ ہے

پنج آہنگ[۱۵]: آسا صیغۂ امراست از آسودن بمعنی تمکین و وقار نیز آید و معنی بانند دہ و فازہ را گویند کہ ہندی آں جمائی ست"

یہاں ایک بات قابلِ توجہ یہ ہے کہ دونوں جگہ جمائی لکھا ہے، نہ کہ جماہی جو اس لفظ کا دوسرا تلفظ ہے سہیلی کی طرح خمیازہ بھی مرزا کا دل پسند لفظ ہے۔

(۱۱) قادر نامہ:

پارہ کہتے ہیں کرٹے کو ہم سے پوچھ پارہ ہے تالا اک عالم سے پوچھ

اس کے لیے پنج آہنگ میں لکھتے ہیں[۱۶]:

پارہ و آں را دست برنجن نیز گویند و آں پیرایہ الیست کہ زناں بدست افگنند و ہندی آں کڑا۔

۱۴۔ ایضاً : ۳۷

۱۵۔ ایضاً : ۳۸

۱۶۔ ایضاً

(۱۲) قادر نامہ

اینٹ کے گارے کا نام آژند ہے ہے نصیحت بھی وہی جو پند ہے

پنج آہنگ[۱۷]: آژند بالف ممدودہ و زای فارسی مفتوح ہندی گارہ خوانند بکاف فارسی.

(۱۳) قادر نامہ:

اَخلَگندُ دُھنجھنا، نیرو ہے زور باد فَر پھرکی ہے اور ہے دُزد چور

پنج آہنگ[۱۸]: باد فراد باد فرایم چرمے مدور کہ ریسمانے در آں انداختہ بگرد انند و ہندی آں پھرکی ست

۱۴ قادر نامہ:

نام مکڑی کا کلاش اور عنکبوت کہتے ہیں مچھلی کو ماہی اور حُوت

پنج آہنگ[۱۹]: کلاش عنکبوت و اسمِ دیگر آں کارتن و تحانہ' آں را تنیج گویند

یہاں میں نے وہ شعر اور ان کے مقابل کی عبارتیں نقل کی ہیں جو ایک ہی لفظ سے متعلق دونوں جگہ ملتی ہیں۔ اب چند ایسے شعر ملاحظہ فرمائیں، جن میں خالص پارسی یا ترکی زبان کے ایسے لغات آئے ہیں، جو بہت کم مستعمل ہیں ؛ اور جو مرزا کی خصوصیات میں سے ہے۔

آگ کا آتش اور آذر نام ہے اور انگارے کا اخگر نام ہے

ہے زَنخ ٹھوڑی، ذقن بھی ہے وہی خاد ہے چیل اور زغن بھی ہے وہی

پھر غلیواز اس کو کہیے جو ہے چیل چیونٹی ہے مور اور ہاتھی ہے پیل

خر گدھا اور اس کو کہتے ہیں اُلاغ دیگدان چولھا جسے کہیے اُجاغ

۱۷۔ ایضاً : ۳۶

۱۸۔ ایضاً : ۳۷

۱۹۔ ایضاً : ۳۸

(الاغ اور اجاغ دونوں ترکی ہیں)

خانہ گھر ہے اور کوٹھا بام ہے — قلعہ دژ، خندق کا کھائی نام ہے
ہے کہانی کی فسانہ فارسی — اور شعلہ کی زبانہ فارسی
لو سنو کل کا سبق آجاؤ تم — گوزی افسار اور ومچی پاردم
ہینگ انگوزہ ہے اور آرزیرانگ — ساز باجا اور ہے آواز بانگ
روئی کی پوئی کا ہے پاغند نام — دوک تکلے کو کہیں گے لاکلام
پند کو اندرز بھی کہتے ہیں ہاں — ارض ہے پر مرز بھی کہتے ہیں ہاں

آخر میں چند ایسے اشعار لکھتا ہوں جن میں بعض ایسے لفظ آئے ہیں جو مرزا کے بہت دل پسند ہیں اور انھوں نے خاص طور پر اپنے کلام میں لکھے ہیں:

انگبیں، شہد او عسل، یہ اے عزیز — نام کو ہیں تین، پر ہے ایک چیز
روئی کو کہتے ہیں پنبہ، سن رکھو — آم کو کہتے ہیں انبہ سن رکھو

(یوں آم کو فارسی میں نغزک کہتے ہیں)

گیتی اور گیہاں ہے دنیا، یاد رکھ — اور ہے نداف دھنیا، یاد رکھ
کوہ کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ — فارسی گلخن ہے، اور ہندی ہے بھاڑ
تکیہ بالش اور بچھونا بسترا — اصل بستر ہے، سمجھ لو تم ذرا
بسترا بولیں سپاہی اور فقیر — ورنہ بستر کہتے ہیں برنا و پیر

غرض کہ اس مختصر رسالے میں متعدد داخلی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ میرزا غالب کی تصنیف ہے۔ اس میں بعینہٖ اسی نہج پر فارسی الفاظ کا موجود ہونا جو وہ "پنج آہنگ" میں لکھ چکے تھے۔ خالص پہلوی لغات کا استعمال جن سے مرزا کو خاص شغف تھا۔ ان الفاظ کی موجودگی جو مرزا کی نگارش کی خصوصیات میں سے ہیں۔ یہ سب باتیں اسے مرزا کی تصنیف ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ابھی میں نے طرزِ کلام اور اسلوب بیان کا ذکر نہیں کیا، ورنہ اس سے بھی ہم اسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

پس روایت اور درایت دونوں کی رو سے یہ ثابت ہے کہ "قادر نامہ" میرزا غالب کے دماغ کی پیداوار

غالب کا ایک نیا خط

غالب کے فارسی دیوان میں ایک قصیدہ سر چارلس تھیوفیلس مٹکاف[1] کی مدح میں ہے، جو انھوں نے ۱۸۳۵ء میں ممدوح کی خدمت میں پیش کیا تھا[2]۔ (قصیدہ ۳۵) سر چارلس بیٹے تھے، ٹامس تھیوفیلس مٹکاف کے، جو اوّل بنگال کی انگریزی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز رہے اور بعد کو ترقی کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ اسی زمانے میں انھیں سر اور بیرونٹ[3] کا خطاب بھی ملا۔

سر ٹامس کے چار بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹے (ہنری) کا صغرسنی میں انتقال ہوگیا۔ البتہ تین ان کے بعد زندہ رہے۔ سب سے بڑے تھیوفیلس جان مٹکاف تھے۔ (ولادت ۱۹ ستمبر ۱۷۸۳ء) یہ ملازمت کے سلسلے میں چین گئے۔ یہاں ان کا بیشتر قیام کانٹن میں رہا۔ یہیں ۱۵ اگست ۱۸۲۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔

دوسرے بیٹے یہی غالب کے ممدوح سر چارلس تھیوفیلس مٹکاف تھے۔ یہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر یہاں ہندستان آئے (۱۸۰۱ء) انھوں نے بہت عروج حاصل کیا۔ مدتوں دلّی اور حیدر آباد میں ریذیڈنٹ رہے اور ۱۸۲۷ء میں گورنر جنرل کی کونسل کے رکن بن کر

۱۔ SIR CHARLES THEOPHILUS METCALFE

۲۔ دراصل یہ قصیدہ فرانس ہاکنس کی مدح میں تھا جس میں مناسب ردّ و بدل کر کے انھوں نے اسے سر چارلس سے منسوب کر دیا۔

۳۔ BARONET

کلکتے پہنچے۔ جب لارڈ ولیم بنٹنک[۴] گورنر جنرل بہت بیمار ہو گئے اور فروری ۱۸۳۵ء میں انھیں صحت کی بحالی کے لیے دکن کے پہاڑی مقام نیلگری جانا پڑا، تو ان کی غیر حاضری کے زمانے میں سر چارلس نائب صدر مقرر ہوئے۔ غالب کے ان سے تعلقات اس زمانے سے تھے، جب یہ دلی میں ریذیڈنٹ تھے۔ اب یہ حکومت مرکزی کے نائب صدر مقرر ہوئے، تو انھوں نے یہ قصیدہ ان کی خدمت میں گزرانا۔

جب آب و ہوا کی تبدیلی سے بھی لارڈ ولیم بنٹنک کی صحت بہتر نہ ہوئی تو وہ مارچ ۱۹۳۵ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر ولایت چلے گئے۔ اب کونسل کے رکن اعلیٰ کی حیثیت سے سر چارلس ان کی جگہ قائم مقام گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ سال بھر بعد ۱۸۳۶ء میں لارڈ آک لینڈ[۵] مستقل گورنر جنرل مقرر ہو کر یہاں آئے، تو سر چارلس صوبۂ غرب و شمال (حال یو۔پی) کے گورنر مقرر ہوئے اور صوبے کا صدر مقام الٰہ آباد کی جگہ آگرہ قرار پایا لیکن ایک اختلاف کی بنا پر انھوں نے ۱۸۳۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ولایت چلے گئے۔ اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے کچھ وقفہ سے جمیکا اور کینیڈا کے گورنر جنرل رہے۔ ان کا دسمبر ۱۸۴۵ء میں بعارضۂ سرطان ولایت میں انتقال ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمپنی کی پوری تاریخ میں سر چارلس مٹکاف کی سی انتظامی قابلیت، دیانتداری، دور اندیشی، احساس فرض کے بہت کم افسر ہندستان آئے[۶]۔

ان تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے ٹامس تھیوفلس مٹکاف[۷] تھے، جن کا نام اپنے

۴۔ LORD WILLIAM CAVANDISH BENTINCK

۵۔ EDEN GEDRGE EARL DF AUCKLAND

۶۔ LIFE AND CDRRESPONDENCE OF CHARLES LORD MATCALFE
یہ سب حالات "سر جوزف" کی تصنیف (لنڈن ۱۸۵۸ء) سے ماخوذ ہیں۔

۷۔ THOMAS THEDPHILUS METCALFE

والد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ ۲ جنوری ۱۷۹۵ء کو لندن میں پیدا ہوئے اور کمپنی کی ملازمت میں داخل ہو کر ۳۰ اپریل ۱۸۱۳ء کو ہندستان آئے۔ تین مہینے تک کلکتے میں کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ دلّی ہو گیا۔ ان دنوں یہاں ان کے بڑے بھائی سر چارلس ریذیڈنٹ تھے، ٹامس ان کے نائب مقرر ہوئے۔ جب سر چارلس جنوری ۱۸۱۹ء میں گورنر جنرل کے دفتر میں کلکتے چلے گئے، تو ان کے جانے کے تھوڑے ہی دن بعد ٹامس نے بھی ریذیڈنسی چھوڑ دی اور دہلی علاقے کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے نائب بن گئے۔ اس عہدے پر انھوں نے چار برس تک کام کیا اور ۱۸۲۳ء میں اسی محکمے میں ان کی ترقی ہو گئی۔ پانچ برس بعد اپریل ۱۸۲۸ء میں وہ دلّی کے مرکزی دفتر مال گذاری میں قائم مقام کلکٹر مقرر ہوئے اور اگلے برس (فروری ۱۸۲۹ء) میں مستقل کلکٹر مقرر ہو گئے۔ وہ یہاں مختلف عہدوں پر ۱۸۳۵ء تک رہے۔ اسی سال مارچ ۱۸۳۵ء میں ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل کے ایجنٹ ولیم فریزر کو ایک میواتی کریم خاں نے قتل کر دیا۔ اس مقدمے کی تفتیش میں ٹامس نے بھی بہت سرگرمی دکھائی تھی۔ بالآخر تحقیقات اور طویل مقدمے کے بعد نہ صرف کریم خاں ہی کو پھانسی کی سزا دی گئی، بلکہ نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکہ بھی اسی سزا کے مستوجب گردانے گئے۔

فریزر کے بعد ٹامس مٹکاف ان کی جگہ ریذیڈنٹ اور ایجنٹ گورنر جنرل کے دوہرے عہدے پر فائز ہوئے اور اپنی وفات تک ۱۸ برس کے طویل زمانے کے دوران میں یہ فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اسی زمانے میں بہادر شاہ کی طرف سے انھیں "معظم الدولہ، امین الملک، اختصاص یار خاں، فرزند ارجمند، فیروز جنگ" کا خطاب عطا ہوا۔ بڑے بھائی کی وفات پر ۱۸۴۵ء کے اواخر میں خاندانی خطاب بیرونٹ ملا، تو اب یہ سر ٹامس تھیوفیلس مٹکاف بن گئے۔

پرانی دلّی میں جمنا کے کنارے کا مٹکاف ہاؤس انھی سر ٹامس نے اپنی اور اپنے خاندان کی سکونت کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ اس عمارت کے تیار ہونے کی ٹھیک تاریخ

معلوم نہیں ہوسکی۔ ایک مصنف ۱۸۳۰ء کے قریب لکھتا ہے،[9] دوسرا ۱۸۳۵ء اور ایک اور ۱۸۴۴ء۔ اس زمانے کا عام رواج یہ تھا کہ انگریز یہاں سے ہر طرح کا سامان وغیرہ بٹور کر انگلستان لے جاتا تھا۔ اس کے برعکس سرٹامس اس مکان کی ترتیب وتحیین کے لیے اپنا تمام خاندانی فرنیچر اور اثاث البیت ولایت سے یہاں دلی لے آئے تھے۔ اس مکان کے علاوہ انھوں نے ایک مکان قطب میں بھی تیار کروایا تھا۔ یہ دراصل اکبر کے کوکا محمد علی خان کا مقبرہ تھا۔[11] انھوں نے اس کی مرمت کروائی اور ضروری حصوں میں مناسب تبدیلی کے بعد اسے رہنے کے قابل بنالیا۔ اس کا نام انھوں نے "دلکشا" رکھا تھا۔

سرٹامس کا یہیں دلی میں ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو انتقال ہوا۔ ان کے خاندان میں یہ روایت چلی آرہی ہے[12] اور دلی میں بھی ان دنوں یہ عام افواہ تھی کہ وہ خاندان شاہی کے ولی عہدی کے جھگڑوں کا شکار ہوئے۔ کشمیری دروازہ (دلی) کے اندر سینٹ جیمز چرچ کے احاطے میں مدفون ہیں۔ گرجے کی عمارت کی شرقی دیوار کے نیچے باہر کی طرف قبر ہے۔

مغلوں میں سب سے پہلے شاہ عالم ثانی نے انگریزوں سے وظیفہ لینا قبول کیا اور اس طرح گویا ان کی ملک کے نظم ونسق اور شاہی خاندان کے نجی معاملات میں مداخلت قبول کرلی۔ شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی تک تو کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن اب انگریزوں نے اتنا اقتدار حاصل کرلیا تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر ولی عہد تک

۸۔ TWILIGHT OF THE MUGHALS از پرسیوال سپیر (کیمبرج، ۱۹۵۱ء): ۱۶۰

۹۔ DELHI از SIR HENRY SHARP (میسور، ۱۹۲۸ء): ۱۰۵

۱۰۔ SEVEN CITIES OF DELHI از GARDEN RISLEY HEARN (لنڈن، ۱۹۰۶ء) ص ۲۱

۱۱۔ واقعات دار الحکومت دہلی، از بشیر الدین احمد (۱: ۴۴۵۔۴۴۶)

۱۲۔ FAMILY RECORDS (مخطوطہ) از میری سٹوارٹ تھیوفیلس کلاڈ بیلی (سرٹامس مٹکاف کی پوتی) موجودہ انڈیا آفس لائبریری لندن

مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مدتوں میرزا جہانگیر اور میرزا ابو ظفر (بہادر شاہ ظفر) کے درمیان ولی عہدی کی کشمکش رہی۔ وہ تو حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا اور میرزا جہانگیر نے بھی پے در پے بعض ایسی حرکات کیں کہ انگریزوں نے اسے رد کر دیا اور پھر اس کا انتقال ہو گیا، ورنہ بہادر شاہ کے بادشاہ بننے کا امکان کم ہی رہ گیا تھا۔

یہی صورت خود بہادر شاہ کے عہد میں پیش آئی۔ جب میرزا دارا بخت ولی عہد کا جنوری ۱۸۴۹ء میں انتقال ہو گیا تو بہادر شاہ چاہتے تھے کہ اب سب سے چھوٹے بیٹے میرزا جواں بخت[۱۳] ولی عہد تسلیم کر لیے جائیں، جو ان کی چہیتی ملکہ زینت محل کے بطن سے تھے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے نو برس کی تھی۔ سر ٹامس مٹکاف نے بحیثیت ریذیڈنٹ اس تجویز کی سفارش نہ کی اور صدر میں اس کے خلاف رائے لکھ کر بھیج دی۔ ملکہ زینت محل قدرتی طور پر اس باعث ان سے سخت ناراض تھیں۔ عام شبہہ یہ تھا کہ زینت محل نے انھیں کھانے میں زہر دلوا دیا ہے[۱۴]۔

(۲)

غالب کو اپنے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان مرحوم کی خدمات کے جلدو میں انگریزی سرکار سے پنشن ملتی تھی۔ اسے وہ دلی ریذیڈنسی سے وصول کرتے تھے، اس لیے لازماً انھیں یہاں کے سارے عملہ و فعلہ سے میل جول رکھنا پڑتا تھا، خاص طور پر جو ریذیڈنٹ بھی یہاں آتا، وہ اس سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیتے تھے۔ جب

۱۳۔ یہ وہی جواں بخت ہیں جن کی شادی پر غالب اور ذوق نے اپنے مشہور سہرے لکھے تھے۔

۱۴۔ سر ٹامس مٹکاف کے حالات ان کتابوں سے ماخوذ ہیں (۲) بنگال سول سرونٹس (۱۷۸۰ - ۱۸۳۸ء) از ڈاڈویل داقلز (۳) PEERAGE AND BARONETAGE (۱۹۴۹ء)
(۳) TWILIGHT OF THE MUGHALS از پرسیوال سپیئر ا ۱۵۷ - ۱۶۳

ٹامس مٹکاف ریذیڈنٹ مقرر ہوئے تو انھوں نے ان سے بھی مراسم بڑھائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ انھیں جانتے تو پہلے سے ہونگے، کیونکہ وہ ان کے بڑے بھائی سر چارلس کو اچھی طرح سے جانتے تھے اور ان کے پیشرو ولیم فریزر سے بھی ان کی دوستانہ راہ و رسم تھی۔

غرض غالب نے مندرجہ ذیل مدحیہ قطعہ ٹامس مٹکاف کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا:

بحضورِ معظم الدولہ، امین الملک، اختصاص یار خان، فرزندِ ارجمند، بجان پیوند سلطانی بارنٹ ٹامس تھیافلس مٹکف صاحب بہادر فیروز جنگ"

امین ملک و ممالک معظم الدولہ — امیر شاہ نشان و کریم ابر نوال
سراں بہ معرکہ فیروز جنگ خوانندش — زہے بطالعِ فیروزِ خویش فرخ فال
ستودہ مٹکف و فرزانہ تھیافلس تامس — ریاضِ شان و شکوہ و بہارِ جاہ و جلال
مآثرِ قلمش نورِ دیدۂ دولت — مکارمِ کرمش روحِ قالبِ اقبال
ز ترکتازِ سوارانِ موکبِ جاہش — بسانِ سبزہ شود چرخِ نیلگوں پامال
بہ منظرش چہ زنی دم ز نیّرِ رخشاں — کہ آں در اوجِ ہوا طائریست زریں بال
کدام نیّرِ رخشاں کہ خود ز منظرِ او — پدید گشتہ در آئینۂ فلک تمثال
زہے عطائے تو کشافِ عقدۂ حاجات — خجے نگاہِ تو وصافِ صورتِ آمال
ز قیصر و جم و دارا فسانہ ہا دارم — و لے نظیرِ تو ام نگذرد بہ وہم و خیال
مگر خدائے جہان آفریں بشوکت و جاہ — نیافریدہ ترا در جہاں عدیل و ہمال
یکے منم ز مسیحا دمانِ فنِّ کلام — یکے منم ز ہما شہپرانِ اوجِ کمال
کہ چوں بمدحِ تو روئے آورم، فرماند — زباں ز نکتہ سرائی خیال گردد لال
بہ بارگاہِ تو کز آسماں بود صحنش — ہمی کنم بسخن تحفۂ دعا ارسال
ترا کہ رونقِ ایں گلشنی، مبارک باد — طرب فزائی پیوندِ نو دمیدہ نہال

ثمرفشانیِ ایں نخل بینی و بہ جہاں　　زنخلِ عیش و طرب برخوری ہزاراں سال

عرضداشت نجم الدولہ، دبیرالملک، اسداللہ خان بہادر نظام جنگ غالبؔ تخلص

اب انھیں فکر ہوئی کہ اس قطعے کو بحسن و خوبی کسی خوشنویس سے لکھوا کر ممدوح کی خدمت میں گزرانا جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے حکیم غلام نجف خان کو یہ خط لکھا:[۱۵]

> و صاحب، یہ پندرہ بیتیں ہیں۔ تقسیم اس کی اسی طرح رکھنا کہ پہلے ایک سیدھی سطر میں صاحب اجنٹ کا نام مع اجزاے خطابی بخطِ نستعلیق لکھا جاوے اور پھر ترچھی پانچ پانچ بیتیں تین بار لکھی جاویں، اور آخر کو یہی سطر جو میں نے اپنے نام کی مع خطاب و تخلص لکھ دی ہے جس طرح کہ ہے، اسی طرح لکھی جاوے۔ کاغذ البتہ بڑا ہوگا، اور تقسیم اچھی طرح کیا جاویگا۔ ان دو سطروں اور پندرہ شعر پر تو صورت بہت اچھی ہوگی یہ ایک نمونہ ہے، مگر نمونہ اچھا ہے۔ تم کسو شخص سے اس کی نقل کرواؤ اور کاتب خوش نویس یعنی مرزا اعباد اللہ بیگ سے لکھواؤ۔ اب آپ اس کو جلد تیار کروائیے اور . . . ۔ آپ کو اب کے صبح ہی میں ملیگا۔
>
> ۔ والسلام . . . .

اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ سے مندرجۂ صدر قطعہ لکھ کر انھیں بھیجا کہ اسے میرزا اعباد اللہ سے لکھوا دیجیے۔ میرزا اعباد اللہ بیگ اس دور کے مشہور خوشنویس میر پنجہ کش کے شاگرد تھے۔ میر پنجہ کش کے شاگردوں میں سے دو شخصوں نے بہت نام پیدا کیا۔ ایک ارسی النسل آغا میرزا نے اور دوسرے میرزا اعباد اللہ بیگ نے۔ آغا میرزا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی گلستاں الور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ روایت ہے کہ اس پر آغا کے پندرہ برس اور مہاراجہ الور کا سوا لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔[۱۶] اس نسخے کے لیے غالبؔ نے تاریخ لکھی تھی، جو

۱۵۔ یہ خط آج تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ اس کے لیے جناب مشفق خواجہ (کراچی) کا شکر گزار ہوں۔

۱۶۔ صحیفۂ خوش نویساں (احترام الدین احمد شاغل عثمانی): ۷۵

میرے مرتّب کردہ نسخۂ سبد چین میں شامل ہے۔ میرزا عباد اللہ بیگ کے والد میرزا عبداللہ بیگ تھے۔ میرزا عباد اللہ بیگ کے معاصرین نے ان کے کمال کا اس طرح اعتراف کیا کہ دربارِ شاہی سے انھیں زمرۂ رقم، خطاب ملا، اور دوست ان کے نام کے ساتھ "اعجاز رقم" بطور لقب لکھتے تھے۔ ۵۷-۱۸۵۵ء کے ہنگامے کے بعد دلّی سے ترکِ وطن کر کے پٹیالے چلے گئے تھے۔ وہیں پچھلی صدی کے آخر میں انتقال کیا۔ میں نے ان کی لکھی ہوئی متعدد وصلیاں دیکھی ہیں۔ بہت پختہ اور دیدہ زیب خط ہے۔ ان کی ایک وصلی نئی دلّی میوزیم میں بھی ہے۔

(۳)

اس خط کی آخری دو سطریں مغشوش ہیں۔ اگر میرزا نے اس کے آخر میں تاریخ لکھی تھی، تو وہ بھی مٹ گئی۔ لیکن اندرونی شہادت کی بنا پر اس کی کتابت کے زمانے کی حدود مقرر کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ طامس مٹکاف کا انتقال نومبر ۱۸۵۳ء میں ہوا۔ اس لیے لازماً یہ خط اس سے پہلے کا ہے۔

۲۔ لکھتے ہیں: صاحب اجنٹ کا نام مع اجزائے خطابی بخطِ نستعلیق لکھا جاوے۔ طامس مٹکاف جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، ولیم فریزر کی وفات کے بعد ریذیڈنٹ اور اجنٹ مقرر ہوئے تھے پس یہ خط مارچ ۱۸۳۵ء اور نومبر ۱۸۵۳ء کے درمیان کسی وقت لکھا گیا۔

۳۔ قطعہ کے عنوان میں غالب نے طامس تھیا فلس مٹکاف کے نام سے پہلے ان کا خاندانی خطاب 'بارنٹ' بھی لکھا ہے، یہ انھیں بڑے بھائی سرچارلس تھیا فلس مٹکاف کی وفات (۱۶ دسمبر ۱۸۴۶ء) کے بعد ورثے میں ملا تھا۔ پس یہ خط ۱۶ دسمبر ۱۸۴۶ء اور ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کے درمیانی زمانے میں لکھا گیا۔ اس خط کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کا ایک

۱۷۔ ایضاً: ۱۳۲

اور قرینہ بھی ہے، لیکن افسوس کو میں اسے استعمال نہیں کر سکتا۔ اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کو شاید کوئی اور صاحب یہ کام کر سکیں۔ وھو ہذا:

قطعے کے آخری دو شعر ہیں:

ترا کہ رونق این گلشنی مبارک باد — طرب فزائی پیوند نو دمیدہ نہال
ثمر فشانی این نخل بینی و بہ جہاں — ز نخل عیش و طرب برخوری ہزاراں سال

بجا طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ یہ قطعہ اس موقع پر لکھا گیا، جب ٹامس مٹکاف کے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے۔

سر ٹامس کی اولاد نرینہ صرف دو لڑکے تھے (۱) سر جان تھیوفلس مٹکاف۔ یہ ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ (۲) چارلس تھیوفلس مٹکاف۔ ان کی تاریخ ولادت ۲۷ اگست ۱۸۳۶ء ہے۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ خط دسمبر ۱۸۴۸ء کے بعد لکھا گیا تھا، بس ان شعروں میں ان دونوں بیٹوں میں سے کسی کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا۔

ان دو بیٹوں کے علاوہ ان کی تین بیٹیاں بھی تھیں (نام لکھنے کی ضرورت نہیں) عین ممکن ہے کہ ان میں سے کسی کی ولادت کی تقریب میں یہ قطعہ کہا گیا ہو، لیکن پوری کوشش کے باوجود مجھے ان میں سے کسی کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ یہ خط ۱۶۔ دسمبر ۱۸۴۸ء کے بعد اور ۳ نومبر ۱۸۵۳ء سے پہلے کسی تاریخ کو لکھا گیا۔

(۴)

اس خط کے مکتوب الیہ حکیم غلام نجف خان سے غالب کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ یہ بڑے عالی خاندان شخص تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں سانویں پشت میں نواب قطب الدین خان عہد اکبری میں بہار کی صوبیداری پر متمکن تھے اور جہانگیر کے زمانے میں بنگالہ اور اڑیسہ کے صوبہ دار رہے۔ اسی عہد میں انھیں پنج ہزاری ذات اور سوار کا منصب بھی ملا۔ ان کے بیٹے فرید بھی عہد جہانگیر

کے نامور امیر ہیں، وہ بھی پنج ہزاری ذات اور پنج ہزاری سوار کے منصب سے سرفراز تھے۔ جہانگیر نے ان کی درخواست پر موضع مویا (ضلع بدایوں) میں چار ہزار بیگہ زمین انھیں عطا فرمائی۔ شیخ فرید نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس کا نام بادشاہ کے نام پر شیخوپور رکھا۔ جہانگیر کا اصلی نام سلیم تھا۔ جو اکبر نے شیخ سلیم چشتی رح سے اپنی ارادت اور عقیدت کے اظہار کے لیے بطور تفاؤل رکھا تھا، لیکن وہ اسے از راہ ادب سلیم کے بجائے شیخو کہ کر پکارا کرتا تھا۔ شیخ فرید نے بھی اب اس نئی بستی کا نام اسی مناسبت سے شیخوپور رکھا۔

حکیم غلام نجف ۵ اکتوبر ۱۸۰۸ء (۲۴ شعبان ۱۲۲۳ھ) بروز شنبہ پیدا ہوئے۔[18] ان کے والد کا نام حافظ محمد نسیم الدین تھا جو شیخوپور کے عمائد میں سے تھے۔ غلام نجف پانچ برس کے سن میں اپنے خالو سید علی کے ساتھ دلّی آئے اور اس کے بعد گویا یہیں کے ہو رہے۔ تعلیم و تدریس کی عمر کو پہنچے، تو طب پر توجہ کی۔ اس علم کی کتب درسیہ کی تحصیل و تکمیل حکیم شریف خان کے فرزند رشید حکیم صادق علی خان سے کی۔ اور نسخہ نویسی اور عملی معالجے کی مشق اور مہارت احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان سے بہم پہنچائی۔ سرسید احمد خان صرف اتنا لکھ کر رہ گئے ہیں کہ "ان کو حاذق الملک (یعنی حکیم احسن اللہ خان) سے قرابت بھی تھی" لیکن خود حکیم غلام نجف خان کے خاندان کی یہ روایت ہے[19] کہ ان کا حکیم احسن اللہ خان کی ہمشیرہ سے نکاح ہوا تھا۔ غالباً سرسید کا اشارہ بھی اسی طرف ہے۔ خاندانی روایت کے مطابق یہ شادی ۱۰ فروری ۱۸۳۴ء کو ہوئی تھی۔ غالب سے انھوں نے فارسی پڑھی تھی۔

حکیم غلام نجف خان اپنے زمانے کے مشہور اطبا میں سے تھے۔ انھیں دربار شاہی میں بھی بار حاصل تھا اور بہادر شاہ ظفر کی طرف سے انھیں "عضد الدولہ حکیم غلام

۱۸۔ مکتوب سید فرخ جلالی بنام راقم

۱۹۔ یہ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے دادا تھے۔

۲۰۔ مکتوب سید فرخ جلالی بنام راقم

نجف خان بہادر" کا خطاب ملا تھا۔[۲۱]
ان کی ایک طبی کتاب "نزہت العاشقین" کے عنوان سے مطبع ہاشمی میں ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ یہ مرض سوزاک سے متعلق ہے۔

غالب کے مکتوب الیہم میں ایک صاحب حکیم ظہیر الدین احمد بھی ہیں اور ان کے نام کا ایک خط چھپ چکا ہے[۲۲]۔ یہ انہی حکیم غلام نجف خان کے بیٹے تھے۔ راشٹرپتی کے سابق طبیبوں میں ایک حکیم ناصر الدین خاں عرف جنٹو میاں تھے، یہ حکیم ظہیر الدین کے پوتے اور شفاء الملک حکیم رضی الدین خان کے بیٹے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔
خطوط غالب میں حکیم غلام نجف خان کے نام کے ۲۳ خط ملتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک یعنی نمبر ۹[۲۳] غالباً ان کے نام کا نہیں اور غلطی سے ان سے منسوب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد دو خط اور ان کے نام کے ملے، جو غلطی سے عبدالحق کے نام سے چھپ رہے ہیں[۲۴]۔
موجودہ خط کو ملا کر اب گویا ان کے نام کے خطوں کی تعداد ۲۵ ہو گئی، اور اسے بلحاظ ترتیب سب مطبوعہ خطوں سے پہلے جگہ ملنا چاہیے۔

۲۱۔ یہ تمام حالات "آثار الصنادید" (سر سید احمد خان) اور "واقعات دار الحکومت دہلی"، از بشیر الدین احمد جلد دوم سے ماخوذ ہیں۔
۲۲۔ اُردوے معلیٰ: ۱۷۴ (مطبع کریمی، لاہور، ۱۹۲۲ء)
۲۳۔ خطوط غالب (۱): ۲۷۸ - ۲۷۹ (سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۲ء)
۲۴۔ اُردو (دلی)، اپریل ۱۹۴۲ء (۲ خط) نیز غالب کی نادر تحریریں (خلیق انجم)، ص ۹۴، ۳۱، جہاں یہ خط اردو سے نقل ہوئے ہیں۔

نادر خطوط غالب

(مرتبہ رسؔا ہمدانی)

پر ایک نظر

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ غالؔب کے سینکڑوں دوست تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں خط لکھے ہونگے۔ ابتدا میں وہ فارسی میں لکھتے رہے، جن میں سے کچھ خط "پنج آہنگ" میں موجود ہیں۔ بعد کو انھوں نے اُردو میں لکھنا شروع کیا اور اگرچہ فارسی میں خط و کتابت بالکل ترک تو نہیں کی؛ لیکن اس کے بعد آخر تک بیشتر اردو میں لکھتے رہے۔ ان کے اُردو خطوں کے دو مجموعے "اُردوے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" پہلے سے موجود تھے؛ ۱۹۳۷ء میں تیسرا رام پور سے "مکاتیب غالب" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں وہ خطوط ہیں، جو میرزا نے نواب یوسف علی خان بہادر فردوس مکان اور نواب کلب علی خان بہادر خلد آشیاں اور بعض اصحابِ رامپور کے نام لکھے۔ پھر ۱۹۴۹ء میں کراچی سے ایک مجموعہ "نادراتِ غالب" کے عنوان سے شائع ہوا؛ اس میں وہ خطوط ہیں، جو میرزا نے منشی نبی بخش حقیر اور ان کے بیٹے کے نام لکھے تھے۔ ۱۹۳۹ء کے وسط میں ایک مختصر مجموعہ[۱] "نادر خطوط غالب" کے نام سے جناب سیّد محمد اسمٰعیل صاحب رسؔا ہمدانی نے شائع کیا۔ اس میں کل ۷۰ خطوط ہیں جن سے متعلق جناب مرتب کا دعویٰ

---

[۱] نادر خطوط غالب مرتبہ سید محمد اسمٰعیل رسؔا ہمدانی گیاوی۔ ٹرپل ایم اے (گولڈ مڈلسٹ) بی، ایل صفحات ۲۶+۳۶۔ ۱۹۳۹ء کاشانۂ ادب، لکھنؤ۔

ہے کہ ان میں سے ۲۳ میرزا تے ان کے پردادا سید کرامت حسین ہمدانی مرحوم کے نام لکھے تھے۔ آخری چار خطوں میں سے تین سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے نام ہیں اور ایک شاہ فرزند علی صوفی منیری کے نام۔

یہاں نادر خطوطِ غالب پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے۔ جناب پیارے لال شاکر میرٹھی (ناشر) کی مہربانی سے رسا ہمدانی والے مجموعے کے جملہ خطوط شائع ہونے سے پہلے مجھے دیکھنے کو مل گئے تھے۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد میں اس نیتجے پر پہنچا تھا کہ ان میں سے بیشتر جعلی ہیں اور جناب رسا نے نہایت جسارت سے کام لیا ہے جو یہ کہا ہے کہ میرزا نے یہ اُن کے پردادا مرحوم کے نام لکھے تھے۔ لیکن چونکہ اس وقت میرے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، نیز میں عنقریب ایک لمبے سفر پر روانہ ہونے والا تھا۔ اس لیے میرے لیے مزید ثبوت جہیّا کرنا دشوار تھا۔ میں نے اپنی اس راے کا اظہار پیارے لال شاکر مرحوم سے کر دیا۔ اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ یہ خطوط شائع نہ کریں اس کے بعد میں ہندستان سے باہر چلا گیا۔ تھوڑے دنوں بعد یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھی موصول ہوا۔ اب مجھے ان خطوط کو باطمینان دیکھنے کا موقع ملا۔ اور میں دوبارہ زیادہ یقین کے ساتھ اسی نیتجے پر پہنچا کہ جناب رسا نے میرزا کے شائع شدہ خطوط میں سے ادھر ادھر کے بعض ٹکڑے لے کر یہ خطوط مرتب کیے ہیں، ملاحظہ ہو:

خط نمبر ۱

دہلی یکم جنوری ۱۸۵۱ء

شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے جو میں تمھیں اُردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور ر

(۱) بندہ نواز، زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے، پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی، حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے ؎
مضمحل ہو گئے قوا غالب! اب عناصر میں اعتدال کہاں
(بنام عبدالرزاق شاکر۔ اُردوے معلیٰ: ۱۶۰)

جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی ؎
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ!
اب عناصر میں اعتدال کہاں

میرے آم کھانے کا حال نہ پوچھو۔ نہار منھ آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں بین الطعامین؛ ہاں، آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں، مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات ؎

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو، زندگانی گذشت

عمدہ اور میٹھے آموں کا پارسل اگر آئے گا، تو میں خوش ضرور ہوں گا اور اگر نہ آئے گا تو میں طلب بھی نہ کروں گا۔

(اس کے بعد مفتی لال کی کتاب سراج المعرفت کے دیباچے کی کچھ سطریں نقل کی ہیں جو میرزا نے لکھا تھا)

(۲)۔۔۔ خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی۔ شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں! طاقت کہاں سے پاؤں! نہ آموں کی طرف وہ رغبت، نہ معدے میں اتنے آموں کی گنجایش۔ نہار منھ آم نہ کھاتا تھا، کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں، بین الطعامین۔ ہاں آخرِ روز بعد ہضم معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ؛ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے، تو پانچ سات ؎

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو، زندگانی گذشت

اب اس کے واسطے کیا سفر کروں مگر حضرت کا دیکھنا۔ اس کے واسطے متحملِ رنجِ سفر

ہوں تو جاڑے میں غنہ برسات میں

ع اے وائے محرومی دید از دگر ہیچ

(بنام چودھری عبدالغفور سرور۔ نوشتہ

بعد غدر ۱۸۵۷ء اردوئے معلّیٰ : ۱۰۷)

آپ نے دیکھا کہ یہ خط پورے کا پورا اس سے پہلے ہمارے پاس موجود ہے، البتہ ایک جگہ کامل نہیں بلکہ ٹکڑوں میں دو جگہ۔ اب آئیے ذرا رسا صاحب کے خط پر ایک نظر ڈالیں:

سب سے پہلے دہلی یکم جنوری ۱۸۵۱ء کا ٹکڑا ہے۔ میرزا عموماً تاریخ آخر میں لکھا کرتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی خط کے شروع میں یا درمیان میں بھی تاریخ کا اشارہ موجود ہوتا ہے۔ جناب رسا صاحب فرماتے ہیں:

> موجودہ روش کے مطابق میں نے تاریخ و مقام خطوط کے سرنامہ پر لکھ دیئے ہیں ورنہ زیادہ تر غالب کے خطوط میں تاریخ آخر میں مرقوم ہے۔ (دیباچہ: ۲۵)

جہاں تک میں نے دیکھا ہے غالب نے اپنے کسی خط میں مقام کا نام نہیں لکھا تاریخ وہ ضرور لکھتے ہیں۔ اگر دہلی غالب کے خطوں میں نہیں لکھا تھا تو جناب رسا صاحب کا فرض تھا کہ وہ بھی نہ لکھتے، یا کم از کم اشارہ کر دیتے کہ مقام کا نام میں نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ (۲) اس خط کے متعلق دیباچہ کے ص ۱۴-۱۵ پر لکھتے ہیں:

> یہ خط ۱۸۵۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں غالب نے لکھا ہے کہ اردو زبان میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ اس سے مولانا حالی کے کلام کی تائید ہوتی ہے (یعنی میرزا مہر نیمروز کی تصنیف سے پہلے خط فارسی میں لکھا کرتے تھے اور انھوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد اردو خطوط نویسی شروع کی) اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے سب سے پہلا خط میرے جدِ اعلیٰ کرامت ہمدانی بہاری مرحوم کے

> نام لکھا اور وہ پہلی تاریخ جنوری ۱۸۵۱ء کو لکھا۔ اُردوے معلّٰی میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں، ان میں سب سے پہلا خط باعتبار تاریخ کے روز یکشنبہ چہارم جنوری ۱۸۵۲ء کا ہے جو منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہے۔

جناب رسا کی اس مختصر عبارت میں ایک آدھ نہیں، تین تین غلطیاں ہیں: غالب نے یہ نہیں لکھا کہ "اُردو زبان میں یہ میرا پہلا خط ہے"، نہ انھوں نے سب سے پہلا اُردو خط ان کے جدِ اعلیٰ جناب کرامت ہمدانی بہاری مرحوم کے نام لکھا، اور نہ اُردوے معلّٰی میں سب سے پہلا خط باعتبارِ تاریخ چہارم جنوری ۱۸۵۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اُردوے معلّٰی میں سب سے پہلا خط اوائل ۱۸۴۹ء کا لکھا ہوا ہے؛ اور یہ منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے جس میں انھوں نے لُنگی کا تقاضا کیا ہے۔ چونکہ اس خط پر تاریخ موجود نہیں تھی، اس لیے جناب رسا کو معلوم نہیں ہوا؛ یہ خط اُردوے معلّٰی کے ص ۳۳۶ پر چھپا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں جوہر والے محولہ فوق خط سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا اُردو خطوط نویسی ۱۸۴۹ء میں (بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے بھی پہلے شروع کر چکے تھے۔ جناب رسا نے مولانا حالی کی تحریر پر بھروسا کر کے یہ خط تصنیف فرمایا اور اس پر تاریخ یکم جنوری ۱۸۵۱ء درج کر دی۔ غرض کہ اگر یہ خط اصلی ہوتا، تو بھی یہ کسی طرح میرزا کا اُردو میں پہلا خط نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ہمارے پاس اردوے معلّٰی کے مطبوعہ خطوں میں کم از کم دو خط ایسے موجود ہیں جو اس تاریخ سے پہلے لکھے گئے تھے۔ ایک میرزا تفتہ کے نام (اردوے معلّٰی: ۳۵۹) اور ایک منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام (اُردوے معلّٰی ص ۳۳۶) اور نادرات غالب میں حقیر کے نام کے خط ان سے بھی قدیم تر یعنی ۱۸۴۸ء کے ہیں۔ خیر، یہ تو رسا صاحب کے خط کا ایک پہلو تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پورے کا پورا خط پہلے سے ٹکڑوں میں موجود ہے جن میں سے ایک خط پر کوئی تاریخ نہیں تھی، لیکن دوسرا خط یقیناً ۱۸۵۷ء کے بعد کا لکھا ہوا ہے، کیونکہ اس کی شروع کی سطروں میں مہر نیمروز کے بعد

ماہ نیم ماہ کے نہ لکھنے کی وجہ اور "غدر" کا ذکر ہے۔ مرزا اپنے خطوں کی نقل نہیں رکھتے تھے، ورنہ بعد کو اُردوے معلیٰ میں چھاپنے کے لیے منشی غلام غوث خان بیخبر اور نواب علاء الدین احمد خان سے خطوط کی نقل نہ طلب کرتے۔ پس یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے ۱۸۵۱ء میں کرامت مرحوم کے نام یہ خط لکھا ہو اور چھ سات برس بعد اسی کو دو حصوں میں تقسیم کرکے عبدالرزاق اور عبدالغفور کے نام بھیج دیا ہو۔

(۳) رسا صاحب کے خط میں ایک اور بات غور طلب ہے: اس میں آموں کے نہ بھیجنے کا ذکر ہے۔ خط یکم جنوری کا لکھا ہے اور یہ سردیوں کے شباب کا زمانہ ہے۔ کیا بہار میں آموں کی فصل ان ایام میں ہوا کرتی ہے؟

(۴) خط میں یہ جملہ بھی ہے: اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا۔ یہاں اصلی خط میں "اپھر جاتا تھا"، ہوگا۔ یہ غلطی عام ہے۔

(۵) آخر میں اس دیباچے کا اقتباس ہے، جو غالب نے مفتی سید رحمت علی خان (عرف میر لال) کی کتاب "سراج المعرفت" کے لیے لکھا تھا۔

(i) یہ کتاب لال قلعۂ دلی کے مطبع سلطانی میں ۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۰ھ (مطابق ۲ فروری ۱۸۵۴ء) کو طبع ہوئی تھی۔ گویا یہ دیباچہ پہلی مرتبہ فروری ۱۸۵۴ء میں منظر عام پر آیا۔ رسا صاحب کے خط کی تاریخ یکم جنوری ۱۸۵۱ء ہے۔ جو چیز اس وقت تک عالم وجود ہی میں نہیں آئی تھی، اس کا ذکر کیا، اور اس کے بارے میں سوال کیا، اور اس کا اقتباس کیا؟ اور ستم بالاے ستم یہ کہ اسی خط میں غالب کی طرف سے لکھا گیا ہے: "سراج المعرفت کا کوئی نسخہ میرے پاس موجود نہیں ہے، ورنہ تمھیں ضرور بھیج دیتا"۔ صرف یہی ایک بات خط کے جعلی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

(ii) ممکن ہے کوئی کہے کہ دیباچہ شاید پہلے لکھا گیا ہو، اور جب کتاب جمادی الاولیٰ ۱۲۷۰ھ (فروری ۱۸۵۴ء) میں طبع ہوئی تو یہ اس میں شامل کر لیا گیا؛ تو یہ عذر بھی غلط ہے۔ دیباچہ واقعتاً لکھا ہی گیا تھا، کتاب کی کتابت و طباعت کے زمانے

میں غالب اسی دیباچے کے اخیر میں لکھتے ہیں:

> حکم دیا حضرت پیرومرشد (یعنی بہادر شاہ ظفر) نے جناب افادت مآب۔۔۔ مولانا مفتی سید رحمت علی خان بہادر کو اور فرمایا اون سے کہ وہ اشغال و اذکار کہ جو۔۔۔ عہد جناب رسالت مآب سے۔۔۔ چلے آئے ہیں، اون کو ایک رسالے میں درج کریں۔۔۔ قضارا یہ ترک کج مج زبان اسد اللہ ہیچمدان کہ جس کا فن سخن میں غالب نام اور وہ خود مغلوب ہوسہائے خام ہے، اوس رسالہ کے مشاہدہ سے مستفیض ہوا۔ چونکہ یہ دردمند واسطے دعائے دولت خاقانی کے بہانہ ڈھونڈھا کرتا ہے، جی میں آیا کہ اس کتاب مستطاب پر ایک دیباچہ لکھے۔ بن لکھے بنتی نہیں چشم داشت یہ ہے کہ بحر عطوفت سلطانی۔۔۔ جوش میں آوے اور اس پاشکستہ جگر خستہ کی دستگیری کریں کہ میں برگ سفر سازکروں اور عزم سفر حجاز کروں۔۔۔۔۔ میرے پیر(و) مرشد برحق سے کیا عجب ہے کہ اپنے خانزاد کو خانۂ خدا کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گنہگار وہاں جاوے اور اگر زیست باقی ہے تو وہاں جاکر اور اپنے ستاون برس کے گناہ کہ جن میں سوائے شرک کے سب کچھ ہے بخشوا کر پھر آوے (سراج المعرفت: ۹-۱۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ

(الف) کتاب کی تسوید مکمل ہو چکی تھی، جب اس کے دیکھنے سے غالب کو اس کا دیباچہ لکھنے کی تحریک ہوئی۔ چونکہ کتاب بہادر شاہ ظفر کے ایما پر لکھی گئی تھی، اس کی کتابت وطباعت میں اس کے بعد غیر معمولی تاخیر کا امکان نہیں۔

(ب) غالب لکھتے ہیں کہ اگر بادشاہ مجھے "خانۂ خدا کے طواف کی رخصت دیں۔

تو وہاں جاکر اپنے ۷۵ برس کے گناہ بخشوا کر پھر آؤں۔ گویا انھوں نے جب یہ دیباچہ لکھا ہے، ان کی عمر ۷۵ برس کی ہو چکی تھی۔ وہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو پیدا ہوئے تھے؛ پس انھوں نے اسے ۸ رجب ۱۲۶۹ھ کے بعد ہی لکھا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں دیباچہ رجب ۱۲۶۹ھ اور جمادی الاولیٰ ۱۲۷۰ھ کے (جو کتاب کی تاریخ طباعت ہے) درمیانی دس مہینوں میں لکھا گیا تھا۔

(ج) جہاں تک میرا علم ہے، "سراج المعرفت" دوبارہ کبھی نہیں چھپی۔ غالب کا یہ دیباچہ اصلی کتاب (سراج المعرفت) کے بعد پہلی مرتبہ اُردوے معلیٰ میں شامل کیا گیا تھا۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ اُردوے معلیٰ میں نقل کرتے وقت اس میں خاصا رد و بدل کیا گیا تھا۔ رضا صاحب نے جو اقتباس دیا ہے، وہ (کتابت کی غلطیوں سے قطعِ نظر) اردوے معلیٰ کے مطابق ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے دیباچے کی یہ عبارت اُردوے معلیٰ سے نقل کی ہے۔

خط نمبر (۲)

دہلی۔ ۱۲ جنوری ۱۸۵۹ء

سنو میاں۔ طرح بفتحِ اول و سکونِ ثانی بمعنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسایشِ دنیا بھی مجاز ہے۔ مرادف طرزِ روش بھی طرح بفتحتین۔ پنج آہنگ تم نے لی۔ دیوانِ فارسی تمھارے پاس ہے، مگر یہ سمجھو کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور اب کہیں سے اُن کا اتمام ممکن نہیں خیر، جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ دستنبو میں نے نذر کی ہے۔ مہر نیمروز معلوم

(۱)۔۔۔ طرح بفتحِ اول و سکونِ ثانی بمعنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسایشِ دنیا بھی مجاز ہے۔ مرادف طرز روش بھی طرح ہے بفتحتین اس کا تفرقہ منظور رہا کرے۔

(بنام چودھری عبدالغفور سرور۔ عود ہندی: ۲۷)

(۲)۔۔۔ پنج آہنگ آپ نے لی۔ دیوانِ فارسی آپ کے پاس ہے۔ مگر یوں سمجھیے کہ یہ دونوں ناتمام ہیں، اور اب کہیں سے اس کا اتمام ممکن نہیں۔ خیر! جو کچھ ہے

نہیں تمہارے پاس ہے یا نہیں!

غنیمت ہے۔ دستنبو میں نے نذر کی ہے،
مہر نیمروز معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا
نہیں الخ
(بنام صاحب عالم مارہروی۔ عود ہندی[۲۸])

اس خط سے متعلق سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ جب اشاعت سے پہلے ان خطوط کا مسودہ میرے پاس آیا ہے تو اس پر تاریخ ۱۲ جنوری ۱۸۵۸ء درج تھی۔ میں نے لکھا، یہ خط جعلی ہے۔ کیونکہ اس میں دستنبو کے نذر کرنے کا ذکر ہے اور یہ کتاب کہیں نومبر میں شائع ہوئی تھی۔ جس چیز کا جنوری ۱۸۵۸ء وجود ہی نہیں تھا، اس کا ہدیتاً آنا یعنی چہ۔ اب اس کے چھپنے کے بعد جو دیکھتا ہوں، تو اس پر تاریخ ۱۲ جنوری ۱۸۵۹ء چھپی ہوئی ہے۔ چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ بلا سے اگر خط ترتیب کے لحاظ سے مہمل ہو گیا، اور اس کے بعد پھر ۱۸۵۸ء کا خط آ گیا!

خط نمبر (۳)

دہلی۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۵۸ء

جانِ غالب بسہ

گرمی از آب بروں رفت و حرارت زہوا
محمل مہرِ جہانتاب بہ میزاں آمد

موسم اچھا آ گیا تھا۔ حسب رائے طبیب تنقیہ ضروری تھا۔ آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔

جو شعر تم نے لکھا ہے، اس پر خط بطلان غلطی سے کھینچ دیا گیا ہے۔ قصد کر کے بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کر دوں گا۔

(۱)۔۔۔۔ جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا، اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا معلوم ہوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائے گی۔ موسم اچھا آ گیا ہے

گرمی از آب بروں رفت و حرارت زہوا
محمل مہرِ جہانتاب بہ میزاں آمد

اگر صرف تبرید و تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا، ورنہ بحسب رائے طبیب تنقیہ کروائیے۔ مجھ کو بھی آج دسواں منضج ہے پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا (بنام

خدا جانے، قلم سے خط کیونکر کھنچ گیا ہے۔
اب حواس بجا نہیں، حافظہ نہیں رہا
اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں۔
جس غزل کے بارے میں تم نے لکھا ہے
وہ میری ضرور ہے، مگر میرے پاس موجود
نہیں ہے۔ میں نے وہ غزل نواب
انور الدولہ سعد الدین خان بہادر شفق کو
بھیج دی ہے، صرف تین شعر مجھے یاد رہ گئے
ہیں، وہ تمھیں بھیجتا ہوں، نہ مطلع یاد
ہے نہ مقطع (اس کے بعد ہوش آور خروش
آور والی زمین کی غزل کے تین شعر ہیں)

انور الدولہ شفق، عود ہندی۔ نیز اردوئے
معلیٰ: ۲۳۴) اسی خط کے آخر
میں نو شعر کی وہ غزل ہے جس میں سے تین
شعر رسا صاحب والے خط میں دیے گیے
ہیں)

(۲) ... نوازش نامہ کو دیکھ کر جانا کہ میں نے
"کمر سے چند" کے شعر پر خط بطلان کھینچ دیا۔
یہ تو کوئی گمان نہ کریگا کہ میں کمر کو کمر بند
نہیں جانتا۔ مہذا وہاں پہلے مصرع
میں اگر کمر بمعنی کمر فرض کیجیے، تو بھی تو شعر
کاٹ ڈالنے کے قابل نہیں۔ قصد کر کے
بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کردوں گا۔
خدا جانے قلم سے خط کیونکر کھنچ گیا۔
اب حواس بجا نہیں محافظہ رہا نہیں۔
اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں ستر برس
کی عمر ہوئی: کہاں تک خرافت نہ آئے۔
اوس شعر کا گنہگار اور حضرت سے شرمسار
ہوں۔ معاف کیجیے گا! زیادہ حدادب۔
(بنام انور الدولہ شفق۔ عود ہندی: ۴۶)

شفق کے نام کے جن دو خطوں کے اقتباس اوپر دیے گئے ہیں، ان دونوں پر تاریخ
درج نہیں اور بظاہر ان کی تاریخ تحریر معلوم کرنا محال نظر آتا ہے۔ لیکن ایک قرینہ
سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا نے ہوش آور اور گوش آور کی زمین میں غزل دستنبو کی اشاعت
کے بہت بعد لکھی تھی۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، دستنبو نومبر ۱۸۵۹ء میں شائع ہو چکی تھی۔

پس اگر یہ غزل نومبر ۱۸۵۹ء کے بعد لکھی گئی تھی تو ظاہر ہے کہ وہ ستمبر میں شفق یا کرامت مرحوم کو نہیں بھیجی جا سکتی تھی ۔ وہ قرینہ کیا ہے؟

صاحب عالم مارہروی کے نام جس خط کا اقتباس اوپر نمبر ۲ کے بالمقابل دیا گیا ہے، اس کے آخر کی عبارت یہ ہے:

> خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی ۔ اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ بہ خود دستنبو میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر غرب و شمال کی مدح میں' اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مدح میں' اور دوبیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو' تو مجھ سے قسم لے لیجیے ۔ قطعہ : بآدم زن' بہ شیطاں طوقِ لعنت الخ ۔ رباعی : دنیا ہیچست و شادی و غم ہیچست الخ ۔ (بنام صاحب عالم مارہروی ۔ عود ہندی : ۲۸

میرزا کو ہمیشہ جستجو رہتی تھی کہ انھیں کوئی ان کی فارسی نظم و نثر کا قدردان ملے ۔ اگر وہ یہ غزل لکھ چکے تھے تو کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ وہ کیوں صاحب عالم کے خط میں اس کا ذکر نہ کرتے، جب کہ مکتوب الیہ خود ان سے "تازہ کلام" طلب کر رہے تھے اور جیسا کہ ان کے خطوں سے ظاہر ہے، میرزا بھی ان کو دوسرے ہندستانی فارسی گوئوں کے مقابلے میں اپنی برتری کا یقین دلانا چاہتے تھے ۔ لازماً یہی نتیجہ نکلے گا کہ انھوں نے اس وقت تک یہ غزل لکھی ہی نہیں تھی اور رسا صاحب والے خط میں جس پر تاریخ ۲۵ ستمبر ہے اس کا ذکر ناممکنات میں سے ہے ۔

خط نمبر (۴)

دہلی ۔ محلہ بلی ماران ۲ مئی ۱۸۵۹ء

جیتے رہو اور خوش رہو ۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی ۔ تمھارا خط

.... شہر کا حال' میں کیا جانوں' کیا ہے! پون ٹوٹی کوئی چیز ہے' وہ جاری ہو گئی ہے ۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں' جس پر محصول نہ لگا ہو ۔ جامع مسجد

آج صبح کو آیا، میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ آج کل یہاں کا حال کچھ نہ پوچھو۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دوکانیں، حویلیاں ڈھادی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیر وعافیت ہے (اس کے بعد غالب کے ایک شعر کی شرح اور کرامت کے ایک شعر پر اصلاح ہے)

کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلیگا۔ دوکانیں حویلیاں ڈھائی جائینگی۔ دارالبقا فنا ہو جائیگی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کی بڑ تک ڈھیگا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔ ۔ ۔ ۔

(بنام میر مہدی مجروح۔ اُردوے معلّیٰ: ۱۱۵ نوشتہ سہ شنبہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ء)

یہ خط بہت دلچسپ ہے۔ جن اصحاب نے غالب کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ انھیں اس سے سخت چڑ تھی کہ کوئی ان سے خط پر پتا لکھنے کے لیے گلی محلّے کا نام پوچھے یا خط کے عنوان میں یہ لکھ دے۔ بلامبالغہ اُردو فارسی تحریروں میں وسیوں جگہ انھوں نے مکتوب الیہ کو لکھا ہے کہ عنوان میں صرف میرا نام اور دہلی لکھ دیجیے، گلی یا محلّہ لکھنے کی ضرورت نہیں: "در دہلی بہ اسداللہ رسد"، بس انھیں اپنی شہرت اور نام آوری کا بڑا خیال تھا۔ اگر کوئی اُن سے محلّہ کا نام پوچھتا، تو وہ اس کا برا مانتے اور خیال کرتے تھے، گویا سائل انھیں گمنام اور ذلیل سمجھ رہا ہے کہ جب تک محلّہ اور تھانے کا نام نہ لکھا جائے، سرکارہ پتا نہ پائے۔ الغرض مجھے یقین ہے کہ غالب نے کبھی بلی ماران نہیں لکھا ہوگا اور یہ "ایجادِ بندہ" غالب کے کردار کے خلاف ہے۔

(۱) یہ محصول دلی میں انگریزی قبضہ کے بہت بعد ساتویں نومبر ۱۸۵۹ء سے جاری ہوا تھا۔ میرزا ایک دوسرے خط میں حسین مرزا کو لکھتے ہیں:

> آج کل یہاں پنجاب احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ یہ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں، نومبر سے جاری ہوگئی۔ سالگرہ خرچ، چھتا لی، بہیش داس ان تین شخصوں کو یہ کام بطریق امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو (اردوئے معلیٰ: ۲۴۳)

پس جب یہ محصول شروع ہی، نومبر سے ہوا تو چھ ماہ قبل، مئی کے خط میں اس کا ذکر کیسے ہو سکتا ہے!

(۲) ایک اور بات

رسا صاحب والے خط میں دلی کے متعدد مقامات کا ذکر ہے۔ اور اس خط کے سمجھنے کے لیے یہاں کے جغرافیہ سے واقفیت اشد ضروری ہے۔ جب تک مکتوب الیہ دلی میں رہا نہ ہو اور وہ یہاں کے گلی کوچوں کے محل و قوع سے خوب واقف نہ ہو خط اس کی سمجھ میں آ نہ سکا نہ وہ اس سے لطف اندوز ہوگا اس صورت میں ان کے بارے میں کچھ لکھنا ہی تہمیل اور بے معنی ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کیا رسا کے پردادا اکرامت مرحوم کبھی دلی آئے تھے، اور کیا وہ ان مقامات سے واقف تھے؟

اب ایک لطیفہ سنیے۔ آپ نے دیکھا کہ دونوں جگہ میرزا نے ایک لفظ "پون ٹوٹی" لکھا ہے۔ لیکن رسا صاحب والے خط میں یہ لفظ موجود نہیں مجھے قوی شبہ ہے کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ یہ لفظ کیا ہے؛ ورنہ وہ ضرور اسے بھی لکھ دیتے اور اگر رسا صاحب والا خط واقعی میرزا کا لکھا ہوتا تو اس میں بھی آپ یہ لفظ ضرور پاتے۔ یہ لفظ "ٹاؤن ڈیوٹی" ہے۔ دلی والے مدتوں اسے پون ٹوٹی ہی کہتے رہے میرزا نے بھی سنا اور لکھ دیا؛ ورنہ وہ خود بھی نہیں سمجھے کہ یہ کیا بلا ہے! اسی لیے سرمہدی

کے خط میں لکھتے ہیں: "پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے

خط نمبر (۵)

دہلی ۲۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء

جانِ غالب یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں۔ میرا حال بعینہٖ وہ ہوتا ہے، جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا خصوصاً اس تموز میں کہ غم و الم کا ہجوم ہے ؎

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو صہیل بوزنِ دلیل کہتے ہیں صیہہ بوزنِ بیضہ عموماً بمعنی ہر صدائے ہولناک و مہیب آتا ہے۔ کیونکر فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں کے قیاس کو وحی سمجھوں اور کیونکر کاتبوں کے املا کو مصحفِ مجید کی طرح سر پر دھروں۔ یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو جمادونبات فرض کرلوں۔

میں نے ابتدائے سنِ تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہِ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی

(۱) ۔۔۔ یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں گرمی میں میرا حال بعینہٖ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا خصوصاً اس تموز میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہے ؎

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

(بنام انوارالدولہ شفق" اردوئے معلیٰ ۲۳۲)

(۲) ۔۔۔ تمھارا محبوب بوہرہ دکنی شین منقوطہ مع التحتانی کے بیان میں شیہہ گھوڑے کے ہنہنانے کو فارسی بتاتا ہے عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو صہیل بوزنِ دلیل کہتے ہیں فیصحہ بوزنِ بیضہ عموماً بمعنی ہر صدائے ہولناک و مہیب آتا ہے۔ میں کیونکر فرہنگ نگاروں کے اور ان کے مددگاروں کے قیاس کو وحی سمجھوں اور کیونکر کاتبوں کے املا کو مصحفِ مجید کی طرح سر پر دھر لوں یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو جمادونبات فرض کرلوں۔ ۔۔۔۔

روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں۔ ہندستان میں رہتا ہوں مگر تیغِ اصفہانی کا گھائل ہوں، جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر، نہ اُردو کا ذکر۔ نہ دنیا میں توقع، نہ عقبیٰ کی امید میں ہوں اور اندوہِ ناکامیِ جاوید۔ جیساکہ خود قصیدۂ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں ؎

چشم کشودہ اند بہ کردارہاے من
زایندہ نا امیدم و از رفتہ شرمسار

نجات کا طالب غالبؔ

(نامۂ غالب بنام میرزا رحیم بیگ نوشتہ ۱۸۶۵ء؛ عودِ ہندی: ۱۲۸)

(۳) تم دانائے رموزِ اُردو زبان ہو، سرمایۂ نازشِ قلمروِ ہندوستان ہو، خاکسار نے ابتداے سنِ تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسطِ عمر میں بادشاہِ دہلی کا نوکر ہوکر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثرِ فارسی کا عاشق اور مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں، مگر تیغِ اصفہانی کا گھائل ہوں، جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر، نہ اُردو کا ذکر، نہ دنیا میں توقع، نہ عقبیٰ کی اُمید۔ میں ہوں اور اندوہِ ناکامیِ جاوید۔ جیساکہ خود ایک قصیدۂ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں ؎

چشم کشودہ اند بہ کردارہاے من
زایندہ نااُمیدم و از رفتہ شرمسار

(بنام عبدالغفور خان بہادر نساخ ۱۸۶۲ء؛ اُردوے معلّیٰ: ۱۵۲)

اس خط کے تین ٹکڑے ہیں اور تینوں زبانِ حال سے اپنے مرتّب کے جعل کی گواہی دے رہے ہیں۔ شروع میں گرمی اور "تموز" کی شکایت ہے۔ رسا صاحب کو معلوم ہے کہ ممکن ہے بہار میں دسمبر، جنوری میں آموں کا موسم ہو، لیکن دتی میں یقیناً ۱۵ اکتوبر گرمی کا زمانہ نہیں کہ میرزا یوں بیتابی کا اظہار کرتے شفق کے جس خط سے یہ ٹکڑا

لیا گیا ہے، اس کا سال تو متعین نہیں ہو سکا (غالباً ۱۸۶۲ء) ہے لیکن مہینا جون یا جولائی ہے، اس میں ہرگز شبہہ کی گنجایش نہیں۔ جون جولائی واقعی گرمی کا زمانہ ہے اور وہاں غالب کی شکایت بجا ہے۔

دوسرا ٹکڑا اس سے عجیب تر ہے۔ میرزا رحیم بیگ کو تو صیل اور شبہہ اور صیحہ وغیرہ سے متعلق لکھنے کا کچھ تک بھی ہے۔ کیونکہ وہاں میرزا مؤلف برہانِ قاطع محمد حسین دکنی اور دوسرے ہندستانی فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں (سعادت علی مؤلف محرق قاطع اور امین الدین پٹیالوی مؤلف قاطع القاطع اور خود میرزا رحیم بیگ مؤلف ساطع برہان) اور اسی قماش کے دوسرے بزرگوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ لیکن کیا رشا صاحب بتا سکتے ہیں کہ چھ برس قبل جب قاطع برہان ابھی طبع بھی نہیں ہوئی تھی اور "فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں" کا وجود بھی نہیں تھا، یہ سطریں کرامت مرحوم کو لکھنے کا کونسا موقع تھا!

پھر ان دونوں عبارتوں کے بعد اپنی صلاحیتوں اور حسرتوں کے بیان کا کون مقام ہے، اور یہ جواب کس سوال کا ہے؟

میرے خیال میں مزید بالمقابل عبارت نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ جن اصحاب کو تصدیق منظور ہو، وہ میرے درج کردہ حوالے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

خط نمبر ۶ اور ۷ کی پوری عبارتیں اسی طرح اردوے معلی اور عود ہندی میں موجود ہیں۔ خط ۶ دو خطوں سے مرتب ہوا ہے۔ یہ دونوں خط چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہیں۔ پہلا حصہ عود ہندی ص ۲۹ پر ہے، آخری حصہ ص ۱۶ پر۔ خط نمبر ۷ کی عبارت بھی دو تین جگہ تقسیم ہو کر چھپی ہوئی موجود ہے۔

خط نمبر ۸ ذرا زیادہ دلچسپ ہے، اس لیے اسے نقل کرتا ہوں:

دہلی بلّی ماران، ۱ اکتوبر ۱۸۶۳ء

"جانِ غالب۔ مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں

شاہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ برسات کا حال کیا پوچھتے ہو! خدا کا قہر ہے، قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خان کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا، مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں، صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے، چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں، مینھ گھڑی بھر برسے، تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے، کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں! ایسی حالت میں اگر خط کے جواب میں دیر ہوا کرے تو خیال نہ کرو۔

(اس کے بعد نقشِ فریادی ہے الخ کی شرح درج ہے)

بلی ماران سے متعلق اوپر لکھ چکا ہوں۔ قارئین حیران ہونگے کہ ۱۸۵۹ اور ۱۸۶۰ء کے خطوں کے بعد یہ ۱۸۵۳ء کا خط کہاں سے ٹپک پڑا۔ لیکن یہ تعجب بیجا ہے۔ جب یہ خط تصنیف ہوا ہے، تو واقعی اس پر تاریخ ۱۸۶۰ء ہی تھی۔ لیکن جب میں نے خط دیکھنے کے بعد پیارے لال شاکر مرحوم سے دریافت کیا کہ قبلہ غدر کے بعد ۱۸۶۰ء میں قلعہ اور شاہزادگان اور ان کے مشاعرے اور میرزا کے وہاں جانے کا ذکر کچھ بےمحل سا ہو معلوم ہوتا ہے، تو حضرت متنبہ ہوئے اور تاریخ ۱۸۵۳ء کر دی۔ جواب آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ پہلا ٹکڑا بلفظہ خان بہادر قاضی عبدالجمیل صاحب جنون بریلوی کے خط میں موجود ہے (اردوے معلیٰ: ۱۵۴)

پہلے ٹکڑے کو درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے ۱۸۶۰ء کی جگہ ۱۸۵۳ء تو لکھ دیا، لیکن یہ خیال نہ رہا کہ دوسرے ٹکڑے کے "طوفانِ نوح" کی تاریخ کا کیا بنیگا۔ یہ عبارت حرف بہ حرف میر مہدی مجروح کے خط کی ہے (اردوے معلیٰ: ۱۳۳) اور یہ

خط جولائی ۱۸۶۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ میرزا کے متعدد خطوں میں اس برسات کا ذکر ہے۔ اسی موقع پر انھوں نے نواب علاء الدین احمد خاں سے کہہ کر مکان مانگا تھا جس سے متعلق ان کا صاحب بہادر اور میم اور بابا لوگ والا لطیفہ مشہور ہے۔ نیز جناب رسا کو معلوم ہونا چاہیے کہ دہلی میں اکتوبر میں ایسا برسات کا موسم نہیں کہ "مینھ دو گھڑی بھرسے، تو چھت گھنٹہ بھر برسے" یہ خزاں کا زمانہ ہے اور ان دنوں شدید بارش تو در کنار، عموماً ایک بوند تک نہیں پڑتی۔

ایک اور بات اس خط کے دو فقرے "عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ اور مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا" ظاہر کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ میرزا کے مکان سے خوب واقف ہے۔ مجروح کے بارے میں تو کسی قسم کا شبہہ نہیں؛ کیا رسا صاحب کے پردادا کبھی دلی تشریف لائے تھے؟

خط نمبر ۹ پر تاریخ دہلی ۳ دسمبر ۱۸۶۰ء" درج ہے اور اس میں وہ لطیفہ لکھا ہے جو حالی نے یادگار غالب میں بیان کیا ہے کہ میر مہدی مجروح نے میرزا کے پانو، اس شرط پر دابے کہ وہ اس کی اجرت قبول کرینگے اور بعد کو میرزا نے کہا: بھیا اجرت کیسی! تم نے میرے پانو، دابے، میں نے تمھارے پیسے دابے۔ چلو حساب برابر سرا بر"۔

رسا صاحب خط شروع کرتے ہیں:

"سنو صاحب! ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ رات میں پلنگ پر پڑا کراہ رہا تھا، میر مہدی پاس بیٹھے تھے۔ اٹھ کر پاؤں دابنے لگے الخ"

نہ صرف یہ کہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں ان کے کراہنے کے لیے ہمارے علم میں کوئی وجہ اور ثبوت نہیں، دسمبر کی ان تاریخوں میں میر مجروح دلی میں تھے ہی نہیں اور یہ اردوے معلی کے مطبوعہ خطوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

خط نمبر ۱۰

دہلی ۹ جنوری ۱۸۶۱ء

شاہ صاحب یہ جو تم نے شکایت نامہ بھیجا ہے، اس کے بعد ایک خط میرا ابھی تم کو پہنچا ہوگا۔ یہ خط آج آیا ہے، آج ہی اس کا جواب لکھتا ہوں۔ اپنا حال کیا لکھوں! ایک بی بی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلو، کلیان، ایاز یہ باہر، مداری کے جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے گئے مہینہ بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی، تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقامِ معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے، وہ بھی بقدرِ سدِ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں! بڑھاپا، ضعفِ قویٰ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے! صاحبِ فراش ہوں، نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ میرے پاس کوئی آنے والا۔

چلمچی کے متعلق جو تم نے دریافت کیا ہے، تو یہ لفظ صحیح ہے غلط نہیں۔ ابھی ابھی میں نے عبدالرزاق شاکر کا قصیدہ دیکھا ہے اور ان کا مطلع درست کیا ہے۔ وہ مطلع یہ ہے ؎

دیکھ لو اپنی چلمچی میں حبابِ آسماں   ہے تمھارا آفتابہ آفتابِ آسماں

دیکھو اس میں چلمچی ہے سلفچی نہیں۔ نجات کا طالب غالبؔ

اس خط کا پہلا فقرہ یوسف مرزا کے خط میں موجود ہے جو ۵ نومبر ۱۸۵۹ء کا نوشتہ ہے (اُردوئے معلیٰ ص ۲۵۴) "ایک بی بی دو بچے" سے لے کر آخر تک پورا پیرا اس سے اگلے خط میں ہے (اُردوئے معلیٰ: ۲۵۵) جو ۲۸ نومبر ۱۸۶۰ء کی تحریر ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ اس خط کا لب و لہجہ اور مضمون بھی حد درجہ واقف کارانہ ہے اور مکتوب الیہ کے لیے میرزا کے خانگی معاملات کے نشیب و فراز سے پوری واقفیت لازمی ہے اور کرامت مرحوم سے متعلق ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت موجود نہیں، ایک اور بات

غور طلب ہے کہ اگر ۲۸ نومبر ۱۸۶۰ء کو گھمن کو واپس آئے ایک مہینہ ہوا تھا ۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو جو رسا صاحب کے خط کی تاریخ ہے، یہ مدت ایک ماہ ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن زیادہ پُر لطف چلبچی والا ٹکڑا ہے۔ اس خط کے آخر میں رسا صاحب نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

> عودِ ہندی کے صفحہ ۱۵۴ میں مرزا غالب کا خط عبد الرزّاق شاکر کے نام چھپا ہوا موجود ہے۔ اس میں میں نے یہ مطلع اپنی آنکھوں سے دیکھا، چلبچی کا لفظ چھپا ہوا ہے، سلفچی نہیں ہے۔ رسا ہمدانی

آمنّا و صدّقنا! جناب رسا صاحب کو اتنی تاکید کی کیا ضرورت تھی، ہم نے پہلے ان کی کونسی تحریر پر شبہہ کا اظہار کیا ہے، جواب چلبچی پر کرتے کہ وہ تصدیق کے لیے عودِ ہندی کو ملاحظہ فرماتے اور پھر ہمیں یقین دلاتے کے لیے اپنی آنکھوں کا واسطہ دلاتے ہیں۔ آخر اتنی زحمت کشی کی کیا ضرورت پیش آئی تھی! ان کے قسمیں کھانے پر شبہہ گزرتا ہے کہ اس میں پسِ پردہ کوئی راز ہے۔ کیا وہ اس پر روشنی ڈالینگے؟

لیکن حیرت ہے تو اس بات پر کہ انھیں شاکر کے خط میں چلبچی کا لفظ تو نظر آگیا لیکن اس کی تاریخ نظر نہ آئی حالانکہ چلبچی اور سلفچی کی بے کار بحث سے یہ کہیں زیادہ اہم بات تھی۔ کیونکہ یہ دونوں لفظ صحیح ہیں اور خود غالب نے ان دونوں لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ شاکر کے نام میرزا کا خط شروع ہوتا ہے:

> قبلہ آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ۸ جنوری کو فقیر دہلی پہنچا، تھکا ماندہ، خستہ و رنجور، ہنوز افاقت کلی نہیں پائی الخ۔

جناب رسا کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرزا یہاں رامپور کے دوسرے سفر سے واپسی کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ اس سفر سے ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو واپس دلّی پہنچے تھے۔ رسا صاحب نے اپنے خط پر تاریخ ۹ جنوری ۱۸۶۱ء دی ہے۔ اب وہ یہ فقرہ ملاحظہ فرمائیں، جو انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے:

> ابھی ابھی میں نے عبد الرزاق کا قصیدہ دیکھا ہے اور ان کا مطلع درست

کیا ہے۔

گویا میرزا ۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو حوالہ دے رہے ہیں ۱۸۶۶ء کے ایک خط کا اور ابھی ابھی تہ کر۔ یا للعجب! رسا صاحب یہ نہیں فرما سکتے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے کاتب نے ۱۸۶۶ء کی جگہ ۱۸۶۱ء لکھ دیا ہے۔ اوّل تو جب میں نے مسودہ دیکھا ہے، اس وقت بھی خط پر سال ۱۸۶۱ء ہی لکھا تھا، اب بھی وہی ہے۔ دوسرے اگلے خطوں پر بھی ۱۸۶۱ء کے بعد کی تاریخیں ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا کوئی خط ۱۸۶۴ء کے بعد کا ہے ہی نہیں۔ چونکہ انھوں نے کتاب میں خطوط کو تاریخ وار درج کیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی اس خط کی تاریخ ۱۸۶۱ء ہی ہے، ورنہ یہ سب سے آخر میں ہوتا۔ ممکن ہے کہ رسا صاحب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق کتابت کی غلطی پر اصرار کریں۔ اس لیے میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ شاگرد والا خط ۹ جنوری کا لکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت دن بعد کا ہے۔ اس سے ان کے لیے "ابھی ابھی" درست ثابت کرنے کے لیے کتابت کی غلطی کا عذر بھی چنداں مفید نہیں ہوگا۔

خط نمبر ۱۱ کا مضمون رباعی کے متعلق ہے جو بعینہٖ چودھری عبدالغفور سرور کے خط میں موجود ہے (عودِ ہندی ص ۲۶)

خط نمبر ۱۲ کی عبارت جوں کی توں منشی شیو نراین کے خط میں موجود ہے (اردوئے معلّٰی: ۲۶۵) فرق صرف اتنا ہے کہ آرام کے خط کی تاریخ ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۸ء ہے، جو موضوع عبارت کے لحاظ سے زیادہ قرینِ قیاس ہے؛ اور رسا صاحب نے "دہلی، بلی ماران، ۲۰ جولائی ۱۸۶۱ء" لکھی ہے۔

خط نمبر ۱۳ ذرا زیادہ اہم ہے، اس لیے اسے نقل کرتا ہوں:

دہلی، بلی ماران ۲۱ اگست ۱۸۶۳ء

"بھائی! تم جیتے رہو اور مراتبِ عالیہ کو پہنچو۔ تمھارے خط میں پچاس پچاس روپے کے دو نوٹ پہنچے۔ میں مسہل میں ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظِ صحت کے لیے مسہل لے لیا ہے۔ تمھاری غزل غور سے پڑھ کر تمھارے

پاس بھیجتا ہوں ؎

بلبل، نہ جا قریب کہ لپٹے ہیں خار، دیکھ　　ہو کر الگ تو باغ سے گل کی بہار دیکھ

اس مطلع کے دوسرے مصرع کو یوں بنا دو ع تو دور ہی سے باغ میں گل کی بہار دیکھ

تمھارے اشعار کی کاپی دیکھی۔ ہائے کیا بُری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی، اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں، بلکہ واقعہ ہے۔ تمھاری مثنوی ایک معشوق خوبرو ہے، مگر بدلباس ہے۔ او بھائی، تمھاری مشق چشمِ بددور صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے، تو میری جان، میرے بعد کیا کرو گے؟ نجات کا طالب غالب۔

اس خط کا مضمون چار مطبوعہ نسخوں سے مرتب ہوا ہے۔ لیکن میں اس سے متعلق صرف دو باتیں عرض کرونگا:

اوّل جب میں نے مسودہ دیکھا ہے تو اس خط پر ۱۸۶۱ء درج تھا۔ میں نے کہا کہ ۲۱ اگست ۱۸۶۱ء تک پچاس پچاس روپے کے نوٹ جاری ہی نہیں ہوئے تھے اس لیے یہ خط جعلی معلوم ہوتا ہے، یہ کہیں ۱۸۹۳ء میں جاری ہوئے تھے اب چھپنے کے بعد اس پر تاریخ ۱۸۶۳ء ہو گئی ہے؎

؎ جب یہ مضمون لکھا گیا ہے، تو مجھے بتایا گیا تھا کہ پچاس روپے کا نوٹ ۱۸۹۳ء میں جاری ہوا تھا، چنانچہ میں نے یہی بات شاکر میرٹھی مرحوم کو لکھ دی۔ انھوں نے غلطی سے گیا وی نے ۱۸۹۳ء کو ۱۸۶۳ء پڑھا۔ خط کی تاریخ تبدیل کر کے ۱۸۶۳ء کر دی گئی۔

لیکن اب جو مضمون دوبارہ دیکھ رہا تھا، تو خیال آیا کہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ پچاس کا کرنسی

دوم اشعار کی کاپی والا مضمون حرف بہ حرف تفتہ کے نام ایک خط میں ہمارے پاس موجود ہے جو مرزا نے انھیں سنبلستان کی اشاعت پر لکھا تھا (اردوئے معلّٰی: ۵۱) اس خط پر تاریخ ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء ہے۔ ممکن ہے میرزا نے بالکل وہی نقط ڈھائی سال بعد جناب کرامت ہمدانی کو بھی لکھے ہوں۔ لیکن اس کا فیصلہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ جناب رسؔا صاحب کے پاس اپنے پردادا کی جملہ تصنیفات ہونگی۔ وہ بتائیں کہ اس خط میں کرامت کی کونسی مثنوی کا ذکر ہوا ہے، اور اس کا سال اشاعت کیا ہے، اور کیا یہ مثنوی ایسے ہی بڑے کاغذ پر چھپی ہے؟

خط نمبر ۱۴ کا ابتدائی حصّہ حضرت صاحب عالم مارہروی کے ایک خط سے ماخوذ ہے، جو عودِ ہندی کے ص ۳۴ پر موجود ہے۔ آخری حصّہ جو ایطا کی بحث سے متعلق ہے، وہ بھی انھیں کے نام دوسرے خط میں ہے۔ (عودِ ہندی: ۱۹)

خط نمبر ۱۵ کا مضمون یادگارِ غالب میں ہے۔ پہلے شعر

اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو!

کی شرح ہے۔ یہ (یادگارِ غالب: ۱۱۹) سے نقل ہوئی ہے۔ اس کے بعد ان کی شراب نوشی کی عادت اور شب کے وقت داروغہ سے بوتلوں کے بکس کی کنجی طلب کرنے کا قصّہ بیان کیا ہے یہ (یادگارِ غالب: ۶۴) پر "ناؤ نوش" کے عنوان سے درج ہے،

(بقیہ حاشیہ) نوٹ کب جاری ہوا تھا تو عجیب و غریب انکشاف ہوا۔ یہ نوٹ سب سے پہلے ۱۸۹۴ء میں جاری ہوئے۔ جب ریزرو بینک آف انڈیا قائم ہوا، تو اس نے ۱۹۳۵ء میں ان کا چلن بند کر دیا۔ یہ دوبارہ ۱۹۷۴ء میں جاری ہوا اور آج تک جاری ہے۔ اگر میں اس وقت شاکر مرحوم کو مطلع کرتا کہ یہ پچاس کا نوٹ تو ۱۸۹۴ء میں پہلی مرتبہ جاری ہوا تھا، تو ممکن ہے رسؔا صاحب خط کی تاریخ بھی ۱۸۹۴ء کر دیتے۔ بلا سے اگر غالب کی وفات اس سے پہلے ۱۸۶۹ء میں ہو چکی تھی۔

فرق صرف اتنا ہے کہ حالی نے ساری بات صیغۂ غائب میں لکھی ہے، اور رسا صاحب نے اسے بدل کر واحد متکلم میں کر دیا ہے۔

خط نمبر ۱۶ کا ابتدائی حصہ بھی یادگارِ غالب میں (ص ۱۱۷، ۱۱۸) اور آخری شفق کے خط میں ہے (اردوئے معلیٰ: ۲۷۰)

خط نمبر ۱۷ سے لے کر بیس تک چاروں خط بعض اشعار کی تشریح پر مشتمل ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ نکات و معارف کس شارح نے بیان کیے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا ماخذ یا یادگارِ غالب ہے یا بجنوری مرحوم کا "محاسنِ کلامِ غالب"

خط نمبر ۲۱ میں شعر کی تشریح کو چھوڑ کر باقی پورا مضمون چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے دو خطوں میں ہے۔ (عودِ ہندی: ۳۲-۳۳، ۳۶-۳۷)

آخری دو خطوں میں تصوف ہے اور کچھ شرحِ اشعار۔

یہ ہے سرگزشت ان ۲۳ خطوں کی جو جناب رسا ہمدانی نے نادر خطوطِ غالب کے عنوان سے مداحینِ غالب کے سامنے پیش کیے ہیں۔ معلوم نہیں شائع شدہ خطوط کو دوبارہ چھاپ دینے میں کیا ندرت تھی اور انھوں نے ایسی جرأت کیونکر کی! کیا انھیں خیال تھا کہ لوگوں نے اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی کا پڑھنا چھوڑ دیا ہے یا یہ دونوں کتابیں دنیا کے صفحے سے ناپید ہو گئی ہیں کہ کوئی ان کی کارگزاری پر مطلع نہیں ہوگا!۔

ایک اور قرینہ ان خطوں کے جناب مرتب کے دماغ کی پیداوار ہونے پر یہ ہے کہ یہ غالب کے طرزِ نگارش کی بعض نمایاں خصوصیات سے عاری ہیں۔ مثلاً میرزا کی یہ عام روش ہے کہ جہاں ان کا مکتوب الیہ مسلمان ہے وہاں وہ اکثر عیسوی تاریخ کے ساتھ ہجری تاریخ بھی لکھ دیتے ہیں۔ اردوئے معلیٰ میں مرتبوں کی سہل انگاری سے بہت کم خطوں کے ساتھ تاریخیں شائع ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے بھی اکثر میں دونوں عیسوی اور ہجری تاریخیں موجود ہیں۔ نیز ان کی عام عادت ہے کہ وہ تاریخ کے ساتھ دن کا بھی اظہار کر دیتے ہیں؛ بہت شاذ حالتوں میں دن کا ذکر نہیں۔ ان ۲۳ خطو

میں ایک خط بھی ایسا نہیں ہے، جہاں ہجری تاریخ یا دن کا ذکر ہو۔

الغرض پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب خط جعلی ہیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ غالب کی تحریریں نہیں۔ بلکہ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، جناب رسا نے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا کے اصول پر عمل کیا ہے۔ انھوں نے مطبوعہ خطوں کے مختلف ٹکڑاوں کو یکجا کر کے یہ خط مرتب کیے ہیں مدعا یہ ہے کہ مرزا نے یہ کبھی ان کے پردادا جناب کرامت مرحوم کے نام نہیں لکھے اور اس کا ثبوت مختصراً یہ ہے کہ

اول: یہ جملہ خطوط ہمارے پاس پہلے سے شائع شدہ موجود ہیں، جو بعض دوسرے اصحاب کے نام لکھے گئے تھے۔ میرزا انھیں خطوط کو جناب کرامت مرحوم کو نہیں بھیج سکتے تھے، جب تک ان کی نقول ان کے پاس نہ ہوں اور یہ معلوم ہے کہ وہ خطوں کی نقل نہیں رکھتے تھے۔

دوم: ان خطوں میں متعدد مقامات پر بعض ایسے واقعات کا ذکر ہے جو مندرجہ تاریخ تک وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے تھے؛ یہ ان کے جعل پر برہانِ قاطع ہے۔

سوم: بعض خطوط میں ایسی ایسی باتیں درج ہیں جن سے لازم آتا ہے کہ میرزا کے مکتوب الیہ کے ساتھ تعلقات نہایت گہرے اور عزیزانہ اور بےتکلفانہ ہوں اور وہ ان کے خانگی حالات سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ جناب کرامت مرحوم میرزا کے ایسے ہی بےتکلف دوست تھے۔

چہارم: یہ خطوط میرزا کے اسلوبِ تحریر کی بعض ضروری خصوصیات سے معرا ہیں۔

دستنبو

غالب نے اپنی مختصر کتاب دستنبو میں اپنے اور دلّی کے زمانۂ غدر یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک کے جستہ جستہ حالات درج کیے ہیں۔ بعض اصحاب نے اس کتاب کو غالب کا روزنامچہ کہا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ یہ تحریر روز بروز نہیں لکھی گئی تھی؛ انھوں نے اسے بہت بعد کو مرتب کیا۔ اس میں جو واقعات لکھے گئے ہیں، وہ بھی سب کے سب قابلِ وثوق نہیں ہیں؛ اور بعض اوقات انھوں نے دانستہ صداقت سے انحراف بھی کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب نے اس ہنگامے میں کوئی عملی حصّہ نہیں لیا تھا۔ وہ شاعر تھے، اس لیے اگر وہ ہنگامی سیاست میں دخل دیتے، تو یہ دخل درمعقولات سے کم نہ ہوتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انھیں سرے سے سیاست سے کوئی سروکار یا دلچسپی نہیں تھی۔ وسط ۱۸۵۰ء سے وہ بہادر شاہ ظفر کے حکم سے خاندانِ شاہی کی تاریخ لکھنے پر مامور تھے۔ اسی موقع پر ظفر نے انھیں خطاب عطا فرمایا اور چھ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ اس تاریخ کا پہلا حصّہ اس ہنگامے سے پہلے چھپ بھی گیا تھا۔ نومبر ۱۸۵۴ء میں ذوق کی وفات ہوئی تو اس کے بعد وہ ظفر کے استاد بھی مقرر ہو گئے۔ شاہی خاندان کے متعدد افراد سے بھی ان کے تعلّقات دوستانہ تھے، اور ان میں بعض ان کے شاگرد بھی تھے۔

لیکن انگریزوں سے بھی ان کے تعلّقات کچھ کم نہیں تھے۔ ان کے چچا انگریزی فوج

میں ملازم رہے تھے اور ان کی وفات بھی اسی ملازمت کے دوران میں ہوئی تھی۔ ان کی خدمات کا خیال کرتے ہوئے انگریزی حکومت نے ان کے لواحقین اور پسماندگان کے لیے وظیفہ مقرر کیا تھا، جس میں سے حصۂ رسدی غالب کو بھی ساڑھے سات سو سالانہ ملتے تھے۔ خود غالب اپنی جوانی کے ایام سے انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کا اعزاز رکھتے تھے۔

گویا غالب کے تعلقات دونوں فریقوں سے بہت گہرے تھے۔ وہ دونوں کے درباری اور وظیفہ خوار تھے۔ اگرچہ غالب کے سے شخص کے لیے دربار اور کرسی اور خلعت اور تمغوں میں عزت و آبرو کی بہت اہمیت تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ اہم، وہ مالی امداد تھی جو انھیں دونوں جگہ سے ملتی تھی۔ ایک جگہ سے چھ سو سالانہ ملتا تھا اور دوسری جگہ سے ساڑھے سات سو سالانہ۔ یہی سو روپیہ ماہانہ کے لگ بھگ ان کی مستقل آمدنی تھی۔ ان حالات میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دیسی فوج نے دلّی کے بازاروں میں ہنگامہ شروع کیا، تو ان کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ انھیں فوراً معلوم ہو گیا ہوگا کہ آخری فتح انگریز کی ہو یا دیسی سپاہ کی ہیں بہر حال گھاٹے میں رہونگا۔ انگریز کو شکست ہوئی اور اُسے یہ ملک چھوڑنا پڑا تو ساڑھے سات سو کی سالانہ خاندانی پنشن کے ہاتھ سے گئی؛ اگر دیسی فوج کو ہزیمت ہوئی اور بہادر شاہ کی نام نہاد بادشاہی بھی ختم ہو گئی، تو اسی کے ساتھ خاندان مغلیہ کی تاریخ نویسی اور چھ سو سالانہ کا وظیفہ بھی ختم ہو جائیگا۔

چونکہ آغاز میں دیسی سپاہ کا پلّہ بھاری تھا۔ اس لیے انھوں نے مصلحتاً برملا ان کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ دربارِ شاہی میں بھی شامل ہوتے اور حسبِ موقع وہاں اپنا کلام بھی سُناتے۔ نواب یوسف علی خان ناظم والیِ رام پور کی خدمت میں لکھتے ہیں

> چون مرا تعلق با بہادر شاہ جز آن نبود کہ ہفت ہشت سال بتحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ وا نمودہ و باصلاحِ اشعارِ شہریار می پرداختم۔ درین

۱- مکاتیبِ غالب : ۹

ہنگامہ خود را بکنار کشیدیم و بدیں اندیشہ کہ مباد، اگر یک قلم
ترک آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رَوَد و جان در معرضِ
تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔
(مکتوب ۱۴ جنوری ۱۸۵۸ء)[۲]

گویا انھوں نے جان و مال کے ڈر ہی سے سبھی بادشاہ اور دیسی امراء سے تعلقات ترک نہیں کیا تھا۔ بعض دوسری شہادتوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ ہنگامے کے دوران میں باقاعدہ قلعۂ معلیٰ میں جانے اور دربارِ شاہی میں حاضری دیتے رہتے تھے۔ منشی جیون لال ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو قلعۂ معلیٰ سے شاہی دربار کی خبر دیتے ہیں

میرزا نوشہ اور مکرم علی خان نے انگریزوں پر فتح پانے کی
خوشی میں قصائد پڑھ کر سنائے۔[۳]

عبداللطیف اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں:[۴]

نوزدہم ماہ روزِ چہاردہم مئی ۱۸۵۷ء صبح گاہے کہ خدیو را
باصلاحِ ملکی علاقہ پیدا شد، فخر الدولہ میرزا امین الدین احمد
خان بہادر، میاں نظام الدین، نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر
و نواب حسن علی خان و نواب احمد علی خان و اعتماد الدولہ میر حامد
علی خان بہادر و نجم الدولہ اسد اللہ خان غالب و نواب بدھن
صاحب و خان جہان خان دارا دت خان و مفتی صدر الدین خان
و کریم علی خان بایوانِ خسروی با صد بندگی حاضر آمدند و زمین
بوسی چہرہ را نگار بستند۔

۲۔ غدر کی صبح شام: ۱۶۹

۳۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ: ۵۹

۴۔ ایضاً : ۹۳

اس سے ثابت ہوا کہ غالب نہ صرف شاہی کلام پر اصلاح کے لیے قلعے جاتے تھے، بلکہ وہاں کے درباروں میں شریک ہوتے تھے۔ عبداللطیف نے جن اصحاب کے نام لکھے ہیں، یہ سب شاہی دربار کے عمائد تھے۔ یہی عبداللطیف ۱۹ ذی الحجہ یعنی ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کے حالات میں لکھتے ہیں[۴]۔

نجم الدولہ مرزا اسداللہ خان غالب قصیدۂ نو آراستہ پیش
خسرو سرائید و خلعتے در بر کشید۔ غالب در علم پارسی غالب
بود۔ تصنیف فراواں از دست۔ ہندی نژاد بود، و ے از
پارسی نژادان گوے سبقت ربود

غالب کے اس مندرجہ صدر صریح اقبالی بیان اور ان دو شہادتوں کے باوجود غالب لکھتے ہیں کہ جس دن دیسی فوج میرٹھ سے آکر شہر میں داخل ہوئی، میں نے اپنے مکان کا دروازہ بند کر لیا اور باہر بازار اور قلعے میں جانا آنا بند کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات درست نہیں، یہ انھوں نے محض انگریزی افسروں کو خوش کرنے کے لیے لکھا تھا۔ غالب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف بھی اس ہنگامے کے دوران میں دلی ہی میں مقیم تھے وہ فراش خانے کے پڑوس میں مرس کی گلی میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی اور بیٹی ہنگامہ شروع ہوتے ہی انھیں نوکروں کی نگرانی میں چھوڑ کر خود جے پور چلی گئی تھیں۔ غالب کو بھائی سے متعلق تشویش تھی، لیکن کچھ کرتے بھی نہیں بنتی تھی میرزا یوسف شورش کے پورے زمانے میں اپنے ملازموں کے ساتھ اکیلے رہے ان کا دماغی توازن بھی ٹھیک نہیں تھا۔ جب انگریزوں نے دلی فتح کر لی تو شہر میں بہت قتل و غارت کیا۔ بہت بےگناہ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ معین الدین حسن خان لکھتے ہیں[۵]۔

مولوی فریدالدین صبح کی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے کہ انگریزی

۴۔ ایضاً، ۹۳

۵۔ غدر کی صبح شام، ۸۰

دستہ انھیں راستے میں ملا۔ جس شد و مد کے ساتھ انگریزوں کا دُکا ہوا دریا اُبل رہا تھا اُس کا تقاضا تھا کہ وہ اُس کی لہروں میں غائب ہو جائیں۔ حکیم احمد حسین خان اور حکیم رضی الدین خان بھی اسی طوفان کی نذر ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خان کے بھائی مرزا یوسف خان جو مدّتِ دراز سے حالتِ جنون میں تھے، گولیوں کے شور کی آواز سن کر یکا یک باہر نکلے اور مارے گئے[٦]۔

یہ بیان معین الدین حسن خان کا ہے، جو اس ہنگامے میں خود بھی انگریزوں کے خلاف تھے اور بڑی مشکل سے پھانسی کے تختے سے بچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرزا یوسف انگریز کی گولی کا نشانہ بنے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی صاحبزادی بگاّ بیگم بھی یہی کہتی ہیں۔ وہ فرماتی ہیں[٧]: سڑس کی گلی میں مارے گئے تھے۔ ان صریح خاندانی شہادتوں (اور روایتوں) کے خلاف غالب دستنبو میں لکھتے ہیں[٨]:

روز دہم اکتوبر (۱۸۵۷ء) ہماں دوشنبہ کہ نامش از سیاہۂ روزہائے ہفتہ ہمی باید سترد، بادے چوں اژدر آذرفشاں جہاں را در خویش فرد بود۔ ہمانا در پاسِ نخستینِ آں روز دربانِ دژم روئے ژولیدہ موے، مژدۂ مُردنِ برادر آورد۔ می گفت کہ آں گرم رَوِ راہِ نیستی پنج روز بہ ہمدمی تپ سوزندہ زندہ ماند و شباہنگام در دلِ شب توسن از یں تنگنا بروں جہاند۔

گویا غالب کے نزدیک وہ بخار سے ۱۸/۱۹ اکتوبر کی درمیانی شب کو فوت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں۔ چونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر میں نے لکھا کہ میرزا یوسف انگریزوں

٦۔ احوال غالب: ۸۷

۷۔ کلیات غالب: (نثر)؛ ۳۹۸

کی گولی کا نشانہ بنے تو وہ ناراض ہونگے۔ اس لیے اُنھوں نے حقیقت سے گریز کیا۔

دراصل یہ کتاب انھوں نے لکھی ہی تھی انگریزوں کے پیش کرنے کو۔ اس سے وہ دو گونہ مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اول، اپنی بیگناہی اور غدر کے ایام میں بھی باغیوں سے بیزاری کا ثبوت مہیا کرنا؛ اور دوم، اپنی خاندانی پنشن کے دوبارہ اجرا کی درخواست۔ چنانچہ جب انھوں نے تفتہ کو دستنبو کا مسودہ آگرے میں چھپنے کے لیے روانہ کیا تو اس کے ساتھ خط میں لکھتے ہیں ۸:

> صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے اور میں نے اوس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔

بات صاف ہے کہ وہ اسے انگریزوں سے دوبارہ تعلقات قائم کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے تفتہ کو لکھتے ہیں ۹:

> منشی شیو نرائن (ناشر) کو سمجھا دینا کہ زنہار [سرورق پر] عُرف نہ لکھیں، نام اور تخلص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے۔

'نامناسب' اور 'مضر' اس لیے تھا کہ یہ خطاب انھیں بہادر شاہ ظفر کی طرف سے ملا تھا اور ظفر اس وقت انگریزوں کے معتوب تھے۔ لہذا انہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں کو ظفر کے ساتھ اپنے گذشتہ تعلقات اور شاہی خطاب یافتہ ہونے کی یاد دلائیں۔

غرض دستنبو کے تمام بیانات صحیح نہیں ہیں اور نہ انھیں جوں کا توں قبول نہیں کیا جاسکتا۔

۸۔ خطوطِ غالب: ۴۸ (بنام تفتہ)
۹۔ ایضاً: ۴۸

کتابیات

۱۔ مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۱۹۴۷ء
۲۔ خطوط غالب مرتبہ مالک رام سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۲ء
۳۔ کلیات نثر غالب (فارسی) نولکشور پریس، کانپور ۱۸۷۵ء
۴۔ غدر کی صبح شام ترجمہ ضیاالدین احمد برنی ہمدرد پریس، دہلی ۱۹۲۶ء
۵۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف، مرتبہ خلیق احمد نظامی
الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۹۵۸ء
۶۔ احوال غالب، مرتبہ مختار الدین احمد، دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۵۳ء

غالب اور صہبائی

غالب کی خود بینی اور خود ستائی اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ اس پر کسی تفصیل سے لکھنا تحصیلِ حاصل سے زیادہ نہیں۔ وہ ہندستان کے کسی فارسی گو شاعر اور ادیب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خطوط میں تقریباً تمام ہندستانی شاعروں اور نثر نگاروں کے نام آئے ہیں اور انھوں نے ان میں سے ایک حضرت امیر خسرو کے سوا کسی کو نہیں بخشا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے ہمعصروں سے متعلق ایک قطعے میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے فرماتے ہیں۔

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم — چہ بامنّت بسیار نہی، زکم شاں
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوتِ شاں، مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں
غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شاں

یہاں انھوں نے چھ معاصروں کا نام لیا ہے اور اپنے آپ کو انکسار سے ان کا ہم نفس اور ہمدم کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں سے ایک صہبائیؒ ہیں۔

صہبائی، جن کا نام امام بخش تھا، نجیب الطرفین تھے سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ

خلیفۂ ثانی تک اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح تک پہنچتا ہے۔ ان کا خاندان تھانیسر کا رہنے والا تھا، لیکن یہ دلّی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ وہ عبداللہ خان علوی کے شاگرد تھے، جن کا نام غالب کے مندرجۂ صدر قطعے میں بھی آیا ہے۔ ان کا کلیاتِ فارسی ان کے ایک ہندو شاگرد (دین دیال میر منشی ایجنسی بھوپال) نے جمع کر کے چھپوایا تھا۔ اردو میں بھی ان کی بعض نثری چیزیں ملتی ہیں۔ قدیم دلّی کالج کے پرنسپل فیلکس بوترو کی فرمایش پر انھوں نے ۱۸۴۳ء میں شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، لیکن اس میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی کی ہے۔ یعنی عبارت میں اتنا ردو بدل اور حذف و اضافہ کیا ہے کہ یہ کتاب ان کی مستقل تالیف ہو گئی ہے۔ اصل کتاب میں مثالیں فارسی میں تھیں، ان کی جگہ انھوں نے اُردو کی مثالیں مہیا کی ہیں۔ بعض جگہ مثالوں میں اپنے چند اُردو شعر بھی درج کیے ہیں، ورنہ یوں وہ اردو میں شعر نہیں کہتے تھے۔ اس کتاب کے علاوہ اسی کالج کی ترجمہ سوسائٹی کے لیے انھوں نے اردو شاعروں کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔ ہر ایک انتخاب سے پہلے انھوں نے شاعر کے مختصر حالات اردو میں لکھے ہیں۔ یہ انتخاب بھی سوسائٹی کی طرف سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ سرسیّد کی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں بھی وہ برابر کے شریک رہے تھے، بلکہ ایک پورے کا پورا باب انھیں کا لکھا ہوا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں دلّی کالج میں عربی کی طرح فارسی کے لیے بھی ایک اچھا مستعد مدرس رکھنے کی تجویز ہوئی تو اس جگہ پر صہبائی کا تقرر ہوا تھا۔ ان بیچاروں کا انجام بہت حسرت ناک ہوا۔ اپنے دو جوان بیٹوں کے ساتھ، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزی گولی کا نشانہ ہوئے۔ انّا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

غالب کے اس قطعے سے خیال ہو گا کہ وہ صہبائی کی شاعری کے قائل اور معترف ہیں۔ یہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ خدا معلوم وہ کس تاثر کے تحت یہ لکھ گئے، ورنہ انھوں نے اور جہاں کہیں بھی صہبائی کا ذکر کیا ہے، حقارت اور مذمت کے لہجے میں۔ برہان قاطع کے مباحثے میں صہبائی کے ایک شاگرد میرزا رحیم بیگ میرٹھی نے بھی غالب کے جواب میں

ایک کتاب "ساطع برہان" لکھی تھی۔ میاں داد خان سیّاح، غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے کسی خط میں اس کتاب کا ذکر کیا، تو انھیں لکھتے ہیں:

> وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر کیا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے مُلّاے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے! باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجونگا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو "لطائفِ غیبی" میں رد کر چکے ہو۔ بہرحال اب اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔[1]

اگرچہ یہاں انھوں نے سیّاح کو لکھا تھا کہ "ساطع برہان" کا جواب دینے کی ضرورت نہیں لیکن بعد کو انھوں نے خود ایک طویل خط میرزا رحیم بیگ کے نام لکھ کر اسے "نامۂ غالب" کے عنوان سے شائع کیا۔ میرزا رحیم بیگ نے ساطع برہان میں اپنے استاد کے نام (امام بخش) کی رعایت سے ایک مقام پر ان کے اسمِ گرامی سے پہلے "امام المحققین" لکھا ہے۔ اسی پر تعریض کرتے ہوئے میرزا "نامۂ غالب" میں ایک جگہ میرزا رحیم بیگ سے ظریفانہ پوچھتے ہیں:[2]

> یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو 'امام المحقّقین' خطاب دیا ہے، کتنے مُحقّقین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب تک نہ اجماعِ محققین کا ہوگا، یہ خطاب بہ اجماعِ اہلِ عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔ وہ فرمانروا ے عہد شہنشاہ کہلائیگا کہ بادشاہ جس کے فرماں پذیر ہو جائینگے۔ ایک سیّد نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا، یہ میر شہنشاہ صاحب کیونکر شاہ جہان و جہانگیر ہو جائینگے! اگر حضرت بفتحۂ قاف بصیغۂ تثنیہ امام المحقّقَین کہتے تو ایک ماموم آپ ہوتے اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔

۱۔ اردوے معلّیٰ: ۲۳ (مطبع کریمی، لاہور)

۲۔ عودِ ہندی: ۱۳۸-۱۳۹ (مطبع کریمی، لاہور)

میرزا نے "نامۂ غالب" اپنے خرچ پر طبع کروایا تھا اور دوستوں میں اس کے نسخے دوست احباب میں تقسیم کر دیے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ایک صاحب مولوی عبد الرزاق شاکر مچھلی شہری بھی تھے۔ معلوم ہوتا ہے میرزا نے انھیں بھی اس کا نسخہ بھیجا تھا۔ اس پر شاکر نے مکتوب الیہ (میرزا رحیم بیگ) سے متعلق پوچھا اور چاہا کہ اگر ہو سکے تو "ساطع برہان" کا نسخہ بھی مہیا کیا جائے۔ اس پر انھیں لکھتے ہیں[۳]

> "نامۂ غالب" کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے؛ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اور دل سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو ان کا شاگرد بنتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزت و قدر ہو۔ رسالہ اس کا "ساطع برہان" دلی پہنچ کر ڈھونڈونگا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچیگا۔

معلوم نہیں اہل دہلی نے کیا کہا اور کیوں کہا! بے شک انھوں نے اپنے کلام پر تو صہبائی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ لیکن "گلستان سخن" مرزا صابر میں صاف لکھا[۴] ہے کہ انھوں نے اپنے چند رسائل، نثر اصلاح کے لیے صہبائی کو بھیجے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے سے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیا تلمذ کے لیے یہ کافی نہیں؟ اس سلسلے میں "گلستان سخن" سے زیادہ اور کوئی بیان قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔

لیکن غالب نے رحیم اور شاکر کے نام صہبائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی رائے ان سے متعلق کیا تھی۔ دونوں جگہ ایک ایک لفظ سے ان کی توہین

۳۔ عودِ ہندی: ۱۵۱، ۱۵۲۔
۴۔ گلستان سخن (نولکشور): ۲۴۱

اور علمی بے وقری کا اظہار مقصود ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ "برہان قاطع" کی بحث میں میرزا اپنا توازن کھو بیٹھے تھے اور اس معرکے میں جو بھی ان کے مدِ مقابل ہوا، انھوں نے اسے نیچا دکھانے کے لیے جائز اور ناجائز تمام حربے استعمال کیے۔ علمی دلائل سے گزر کر طنز و طعن اور تمسخر و تشنیع سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ یہاں اتفاق سے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اصلی ہدف تو میرزا رحیم بیگ تھے، صہبائی بیچارے ان کے استاد بھی لپیٹ میں آ گئے۔ اگر اور کوئی شہادت موجود نہ ہوتی تو یہ توجیہہ کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے ایک اور جگہ بھی صہبائی کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

میرے پاس غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر قلمی مجموعہ تھا[5]۔ اس میں چند قصیدے، قطعات اور رباعیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام معاصر اخباروں وغیرہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں میں کہیں کہیں، غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔

اس مجموعے میں منجملہ اور چیزوں کے ولی عہد ظفر، مرزا فتح الملک بہادر کی مدح کا وہ قصیدہ بھی ہے، جو اس وقت مطبوعہ کلیات میں نمبر ۴۸ پر ہے۔ اس کا مطلع ہے:

بازم نفس از سینہ بہنجار بر آمد
شد زخمہ رواں، زمزمہ از تار بر آمد

اس کے بعد دوسرا اور تیسرا شعر ہے:

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفے ز لبِ کافر و دیندار بر آمد
آں از نعم آوازۂ انکار در افگند
ایں راز بلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

یہاں غالب حاشیے میں لکھتے ہیں:

۵۔ اب یہ خطی نسخہ جناب کالی داس گپتا رضا، بمبئی کے پاس پہنچ گیا ہے۔

> چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی پیشِ معتقدانِ خویش کہ خر کرّہ چند بودند گفت: افسوس کہ غالب عربی نمی داند و از نعم معنیِ انکار افادہ می کنند، حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنیٰ است۔ مولوی آل نبی یکے از یاران غالبؔ عبارتِ شرح ملا کہ رفعِ ایں وسوسہ می کرد، بوے نمود و گفت: غالبؔ حق گفتہ است و تو غلط فہمیدہ۔ سوال از جانبِ حق ایں است: اَلَستُ بربکم؟ آیا نیستم پروردگارِ شما؟ و ایں کلمہ استفہامیہ است۔ کفار گفتند: ہاں نیستی خداے ما، مومناں گفتند: ہاں، ہستی خداے ما۔ آں تسلیم انکار است و ایں تسلیمِ اقرار۔ مولوی چوں خر در وحل فرو ماند۔

اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

مولانا فضلِ حق خیرآبادی

مولانا فضل حق خیرآبادی (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۱ء) اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے بلکہ معقولات میں تو آخری دور کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہ امتیاز ان کے خاندان میں بہت دن تک جاری رہا اور آج تک ان کا نام علمی اور تعلیمی حلقوں میں ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔

اگر اسی پر اکتفا کر لیا جاتا تو یہ بھی کچھ کم امتیاز نہیں تھا۔ لیکن ان کے مداحوں نے اس پر قناعت نہ کی اور چاہا کہ انھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو اور "افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر" کا مصداق بھی قرار دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ان پر جو مقدمہ قائم ہوا تھا اور جس میں آخر کار انھیں کالا پانی کی سزا ہوئی تھی، اس کی رُوداد کچھ ایسے انداز سے لکھی گئی کہ اس میں تاریخ سے زیادہ ڈراما کا لطف پیدا ہو گیا۔

سب سے پہلے ان کے مقدمے کی مفروضہ کارروائی اور اس میں ان کے مشہور ا نہ دفاع سے متعلق شبہہ اس وقت پیدا ہوا جب مولانا امتیاز علی خان عرشی نے اپنے مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد" میں مولانا مرحوم کا ایک خط

۱۔ مشورۂ تحریک، اگست ۱۸۵۷ء

شائع کیا، جو انھوں نے فردوس مکان نواب یوسف علی خان والیِ رام پور کو لکھا تھا۔ اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف انھوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ آخر تک اس سے اپنی بے تعلقی اور عائد کردہ الزامات سے بیگناہی ثابت کرنے کے لیے پوری تگ ودو کرتے رہے۔

ان کے مقدمے کی جو کیفیت آج تک شائع ہوئی ہے[۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ مولانا فضل حق مرحوم پر یہ مقدمہ "سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جُرم بغاوت" کی بنا پر قائم ہوا تھا۔

۲۔ جس جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تھا، وہ ان کا شاگرد تھا؛ اس لیے اسے ان سے ہمدردی تھی اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ بَری ہو جائیں۔

۳۔ جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بَری کر دینے کے حق میں تھا۔

۴۔ مولانا فضلِ حق نے خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل مثل تارِ عنکبوت عقلی و قانونی ادلّے توڑ دیے تھے اور اُمید تھی کہ وہ بَری کر دیے جائینگے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتوے کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہوا ہے" وہ صحیح ہے؛ میرا لکھا ہوا ہے؛ اور آج اس وقت بھی، میری وہی رائے ہے"

۵ اس اقرار و اقبال کے بعد عدالت نے "بجد رنج کے ساتھ" حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کا حکم سُنایا۔

۶۔ یہ فیصلہ آپ نے کمال مسرّت اور خندہ پیشانی سے سُنا۔

افسوس کہ واقعات سے یہ تمام دعاوی ٹھیک ثابت نہیں ہوتے۔

---

۲ دیکھیے "باغیِ ہندستان" (از مولانا محمد عبدالشاہد خان شروانی؛ ۱۶۸ - ۱۷۲ (مدینہ پریس بجنور - ۱۹۴۷ء)

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مندرجات "سیر العلما" مصنفہ مولانا بہاء الدین گوپاموی کی کتاب پر مبنی ہیں، لیکن یہ موخر الذکر تالیف میری نظر سے نہیں گزری

۲

مولانا فضل حق کے مقدمے کی ابتدائی سماعت[۳] کپتان ف۔ ا۔ و تھربرن F.A.V. THURBURN نے لکھنؤ میں کی تھی۔ یہ مقدمہ ۲۲ فروری ۱۸۵۹ء کو ان کی عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہ تھے: (۱) عبدالحکیم، اکسٹرا اسسٹنٹ، دریاباد؛ (۲) تجمل حسین؛ (۳) فضل حسین؛ (۴) رام دیال؛ اور (۵) مرتضیٰ حسین۔

سب سے پہلے عبدالحکیم نے بیان دیا۔ اس نے کہا:

> مئی ۱۸۵۸ء میں جن دنوں میں کارِ سرکار پر دریاباد میں متعین تھا، منتظم حسین نے مجھے گرفتار کر لیا اور بیگم حضرت محل کے پاس بھیج دیا، جو ان دنوں بونڈی میں مقیم تھے۔ یہاں مجھے ممو خان اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا۔ ممو خان نے مولانا فضل حق سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ مولانا نے "فتویٰ"[۴] دیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے اس لیے سزائے موت کا مستحق ہے؛ اسے بلا تاخیر موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ اس پر کاظم علی نے، جو وہاں موجود تھا، یہ مشورہ دیا کہ اسے قتل کرنے کی بجائے قید کر دیا جائے۔ چنانچہ میں قید خانے بھیج دیا گیا۔ یہاں میں ایک مہینا بیس دن رہا۔ آخر کار مجھے تجمل حسین (ساکن بتوہو) اور بعض اور اشخاص کی سفارش پر رہائی ملی۔ اس زمانے میں مولوی فضل حق کیمپ میں موجود نہیں تھے۔ یہ مولوی احمد شاہ کی جاداد کی ضبطی کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔

۳۔ اتفاق سے اس مقدمے کی مسل حکومت کے پرانے کاغذات میں دستیاب ہو گئی ہے۔ یہاں مقدمے کے جو کوائف لکھے گئے ہیں، وہ سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ ہر جگہ حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جو باتیں دوسرے ماخذ سے لی گئی ہیں، وہاں حوالہ دے دیا گیا ہے۔

۴۔ یہ ہے وہ فتویٰ جو بنائے مقدمہ بنا اور جس کی طرف فردِ جرم میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی مزید وضاحت مولانا نے قصیدۂ ہمزیہ میں کی ہے، جس کی تفصیل آگے آئیگی۔ میں نے اسی جگہ ایک وضاحتی حاشیہ بھی لکھ دیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر یہ وہاں ہوتے، تو مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوتی"۔
مولوی فضل حق، ممّو خان کے مشیر اور اس کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے۔
چونکہ ان کا خیمہ اس خیمے کے نزدیک تھا جس میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ اس لیے میں انھیں دیکھا کرتا تھا۔ یہ کثرت سے ممّو خان کے پاس جایا آیا کرتے تھے۔ میں انھیں خوب پہچانتا ہوں؛ انھی نے میری موت کا فتویٰ دیا تھا۔

سوال (از مولانا فضل حق) کیا تم اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی شہادت پیش کر سکتے ہو؟

جواب: ہاں، چودھری مرتضیٰ حسین جو میرے ساتھ قید میں تھے اور شیخ عبد العلی (گولہ گنج والے) میری تصدیق کریںگے۔

سوال (از مولانا فضل حق) کیا کسی سنّی کا فتویٰ شیعہ کے لیے قابل قبول ہوگا؟[۵]

جواب: بغاوت کے دنوں میں شیعہ سنی کا امتیاز اٹھ گیا تھا۔" عبد الحکیم کا بیان ختم ہوا، تو تجمل حسین کی طلبی ہوئی۔ اس نے حسب ذیل گواہی دی:

میں بحکم سرکار مئی ۱۸۵۸ء میں عبد الحکیم کی رہائی کے لیے لونڈی گیا تھا، جہاں ان دنوں ممّو خان اور حضرت محل اور برجیس قدر مقیم تھے۔ وہاں میں نے مولوی فضل حق کو باغیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ یہ ممّو خان کے مشیروں میں شمار ہوتے تھے اور اسی حیثیت سے اس کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ میں باغی ڈیرے میں کوئی ڈیڑھ مہینا رہا۔ مجھے وہاں پہنچے مہینا بھر ہوا ہوگا کہ مولوی فضل حق اور میر مہدی دونوں، مولوی احمد اللہ شاہ کی جاداد ضبط کرنے کو مقرر کیے گئے۔
میں مولوی فضل حق کو پہچانتا ہوں۔

۵۔ جیسا کہ آگے خود مولانا کے بیان سے ظاہر ہوگا؛ یہ عبد الحکیم شیعہ تھا؛ اس لیے یہ سوال کیا گیا۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا یہ باغی حکومت کے ملازم تھے یا نہیں؛ نہ مجھے اس کا علم ہے کہ ممّوخاں ان پر اعتماد کرتا تھا یا نہیں۔

ہاں ایک اور فضل حق بھی ہیں۔ میں جس زمانے میں بوندی کے باغی کیمپ میں تھا، وہ بھی دو دن کے لیے وہاں آیا تھا اور اس کے بعد خان علی خان ناظم شاہجہاں پوری کے پاس واپس چلا گیا۔

اس زمانے میں وہ لاتن سُنّیوں اور شیعوں کے فتوے قبول کرلیے جاتے تھے۔ لیکن میں نے مولوی فضل حق کا کوئی فتویٰ نہیں دیکھا۔

استغاثے کا تیسرا گواہ فضل حسین تھا۔ اس نے مولانا فضل حق کو شناخت کیا اور کہا:۔

> یہ خیرآباد کے رہنے والے ہیں۔ آج سے دس بارہ برس پہلے یہ واجد علی شاہ کے ہاں ملازم تھے۔ جب آٹھ مہینے پہلے بیگم حضرت محل، بھاگ کے بوندی گئی ہے تو یہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے مولوی فضل حق کو دیکھا۔ یہ وہیں قلعے کے اندر بیگم کی جائے سکونت کے شمال کی طرف ایک عمارت میں مقیم تھے۔ میں انھیں وہاں کوئی دو مہینے تک دیکھتا رہا یہ ممّوخاں کے دربار میں روزانہ جاتے تھے اور ممّو لوی خان کے نام سے پکارے جاتے تھے۔
>
> مجھے معلوم نہیں کہ یہ بوندی کیوں گئے رہتے۔

اس کے بعد رام دیال گواہ پیش ہوا۔ اس نے بیان دیا:

> پانچ مہینے کی بات ہے کہ میں نے فضل حق کو بوندی میں دیکھا جہاں بیگم (حضرت محل) فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ یہ (مولوی فضل حق) ممّوخاں کے دربار میں حاضری دیتے تھے جس دن عبدالحکیم گرفتار ہو کر آیا ہے، میں (دربار میں) موجود تھا۔ جب عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین کو ممّوخاں اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا، تو انھوں نے (یعنی مولوی

فضل حق سنے) ان دونوں سے پوچھا کہ تم انگریزوں کی ملازمت کیوں کرتے ہو۔ عبدالحکیم نے جواب دیا کہ میں تو ان کا ملازم ہوں اور انھیں کے ساتھ رہتا ہوں۔ مرتضیٰ حسین نے مولوی فضل حق کو قرآن سے کوئی جواب دیا تھا۔ میں نے ممّو خان سے کہا کہ یہ دونوں موت کے سزاوار نہیں انھیں چھوڑ دینا چاہیے۔ ممّو خان نے ان کے بیان سن کر کہا کہ عبدالحکیم کو رہا کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ یہ اپنے بھائی محمد عسکری کو لے آئے۔ میرے سامنے کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا؛ میرے آنے سے پہلے شاید دیا گیا ہو۔

اب سب سے آخری گواہ مرتضیٰ حسین حاضرِ عدالت ہوا اس نے کہا:۔

جب مجھے عبدالحکیم کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے تو اس سے میرے پانچویں دن ہمیں داروغہ ممّو خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت (مولوی) فضل حق نے مجھ سے پوچھا۔ کیا تم پڑھ سکتے ہو۔ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ شرعی لحاظ سے تم مرتد ہو، مرتد کا قتل جائز ہے۔ انھوں نے مجھے مرتد اس لیے کہا، کیونکہ میں حکومت (انگریزی) کا ملازم تھا۔ ممّو خاں نے کہا کہ کسی طرح محمد عسکری تحصیلدار نواب گنج کو توڑا جائے، اگر وہ آجائیں تو انھیں اس سے دُگنی تنخواہ دی جائیگی، جو انھیں اس وقت ملتی ہے۔ عبدالحکیم نے جواب میں کہا کہ میں انھیں لا تو نہیں سکتا، البتہ اس مفاد کا خط ان کے نام لکھ دے سکتا ہوں۔ اس پر سب اٹھ کر چلے گئے، اور ہمیں واپس قید خانے میں بھیج دیا۔

اس کے چار دن بعد ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔

پھر ممّو خان نے مجھے مولوی فضل حق کی جائے سکونت پر بُلا بھیجا اور کہا کہ اگر تم پچاس ہزار روپیہ فوج کے خرچ کے لیے ادا کردو، تو تمھاری جان بچ سکتی ہے؛ اور اگر نہیں ادا کرو گے تو توپ کے منھ سے اڑا

دیے جاؤگے۔
ممّو خان مولوی فضل حق سے بہت عزت و احترام سے پیش آتا تھا۔
وہ مولوی فضل حق کے پاس خود چل کے جاتا تھا، مولوی فضل حق اس کے دربار میں بھی آتے تھے۔
میں نے سنا تھا کہ لونڈی میں کوئی شوریٰ بیٹھتی ہے جس میں یہ مولوی فضل حق بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہ پچھلی مئی (یعنی ۱۸۵۸ء) کی بات ہے۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا مولوی فضل حق نے کوئی فتویٰ دیا تھا۔
میں دو مہینے ۲۳ دن قید خانے میں رہا اور سات ہزار روپے دے کر رہائی حاصل کی۔ میری رہائی کے وقت مولوی فضل حق وہاں نہیں تھے، یہ ان ایام میں احمد اللہ شاہ کی جاداد ضبط کرنے کو گئے ہوئے تھے۔
میں فضل حق کو پہچانتا ہوں۔
جب ہمیں پہلی مرتبہ ممّو خان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس دن رام دیال بھی وہاں موجود تھا۔

ان گواہوں کے بیانات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اب اس سے کوئی فائدہ بھی مترتب نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ان کے باہمی تضاد ظاہر ہیں۔
ان میں سے عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین، دونوں کے بیانات بہت اہم ہیں اور بعد کو یہی سارے مقدمے کی بنیاد بنے۔ دوسرے لوگوں کے بیان تو محض تائیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا فضل حق نے اپنے عربی رسالے "ثورۃ الہندیہ" میں لکھا ہے[6]:

حاکم نصرانی کے سامنے دو مرتد، سخت دل دشمنوں نے میری چغلی کھائی۔ وہ دونوں قرآن کی آیت کے معانی سے متعلق مجھ سے بحث کرتے تھے، حالانکہ اس کا صاف حکم یہ ہے کہ جو نصاریٰ کا دوست ہے، وہ خود بھی نصرانی کے حکم میں ہے۔ وہ دونوں شخص نصاریٰ کی دوستی پر مصر تھے۔ انھوں نے ارتداد

۶۔ باغی ہندوستان: ۱۴۱

اختیار کیا اور اپنے ایمان کو کفر سے بدل لیا۔

یہاں ان دشمنوں سے یہی عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین مراد ہیں جنھوں نے ان کے خلاف گواہی دے کر بناے مقدمہ قائم کی تھی۔

جب استغاثہ کے سب گواہوں کے بیان قلم بند ہو چکے، تو خود ملزم یعنی مولانا فضل حق کی طلبی ہوئی اور ان کا بیان لکھا گیا۔ انھوں نے کہا:

میں راجہ الور کے ہاں ملازم تھا اور بغاوت شروع ہونے کے زمانے میں اسی کے پاس تھا۔ راجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینے تک میں الور میں رہا۔ میں اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا۔ وہاں میں پندرہ دن رہا اور پھر واپس الور چلا گیا۔ میں نے اپنے اہل و عیال کو یہاں الور میں چھوڑا اور دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیرآباد کی راہ لی۔ جب سے میں اپنے مکان پر مقیم ہوں؛ نہ میں نے کسی کی ملازمت کی، نہ باغیوں میں شامل ہوا۔ میر فتح حسین، محمد حسین اور احمد علی خان میرے گواہ ہیں۔ نبی بخش اور قادر بخش، امام علی، علی محمد اور ممّو خان خیرآباد کے رہنے والے میرے چال چلن سے واقف ہیں۔ میں خیرآباد سے اس لیے نکلا تھا، کیونکہ یہاں کے تمام باشندے بیگم (حضرت محل) کے ساتھ بھاگ گئے تھے۔ میں یہاں سے نکل کر چند دن کھیری، ہرگاؤں، تنبول، سہور پور وغیرہ میں رہا۔ کچھ دن مُتّریہ میں بھی گزارے۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۸ء کو میں نے کرنیل کلارک سے سبیہا کے مقام پر ملاقات کی۔ اس سے پہلے میں بریگیڈیر ٹروپ سے مل چکا تھا۔ بریگیڈیر ہی نے مجھے کرنیل کے پاس بھیجا تھا۔ کرنیل کلارک نے ایک روبکار لکھی اور حکم دیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ میں ۳۰ دسمبر کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوا اور اپنے مکان ہی پر ٹھہرا رہا۔ ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلا بھیجا اور لکھنؤ روانہ کر دیا۔

فضلِ حق ایک اور شخص کا نام ہے۔ مجھے اس کی جگہ گرفت کر دیا گیا ہے۔ وہ آج کل شاہزادہ فیروز شاہ بن بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہے یہ فضلِ حق سابق میں آنولہ کا تحصیلدار تھا اور اس نے خان بہادر خان اور بیگم (حضرت محل) کی ملازمت بھی کی ہے۔ وہ ذات کا تیند اور شاہجہاں پور کا رہنے والا ہے۔

یہاں مولانا فضلِ حق نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ میں مہاراجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینا تک الور میں رہا اور اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا اور پھر یہاں پندرہ دن رہ کے واپس الور چلا گیا۔ چونکہ مہاراجہ بنے سنگھ کی وفات ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء (۹ ساون سمت ۱۹۱۴ بکرمی) کو ہوئی تھی۔ اس لیے وہ ۱۵ اگست کے لگ بھگ الور سے چلے ہوں گے۔

دہلی میں ان کی دوسری بیوی جناب امراؤ بیگم تھیں۔ وہ اپنے دونوں صاحبزادوں شمس الحق اور علاء الحق کے ساتھ محلہ بلی ماران بارہ دری شیر افگن میں مقیم تھیں۔ مولانا فضلِ حق اپنے عربی رسالے "الثورة الہندیہ" میں لکھتے ہیں :

> اس وقت دہلی میں میرے بہت سے اہل و عیال مقیم تھے، اور مجھے وہاں سے بلاوا بھی آیا تھا۔ مجھے کامیابی کی توقع تھی اور خیال تھا کہ (دہلی جانے سے) شادمانی اور مسرت حاصل ہوگی۔ لیکن غیب سے جو کچھ مقدر ہو چکا تھا کسی کو کیا معلوم بہرحال میں نے دہلی جانے کی ٹھان لی جہاں میرا مکان تھا اور روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کے میں اپنے اہل و عیال سے ملا اور میں نے لوگوں کو (ہنگامے سے متعلق) اپنی عقل و فہم کے مطابق مشورہ دیا۔ لیکن نہ انھوں نے میرے مشورے پر عمل کیا، نہ میرا کہا کیا۔

۷ - مرقع الور (از محمد مخدوم تھانوی) : ۱۵۵

۸ - باغی ہندوستان : ۳۲۸

یہ وہ زمانہ ہے جب انگریزی فوجیں پوری قوت سے دہلی پر حملے کر رہی تھیں اور بدقسمتی سے دیسی سپاہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ان کا مشورہ قبول کرنے کا موقع ہی کونسا تھا؛ یہاں تو نفسا نفسی کا عالم تھا۔ انجام کار دیسی سپاہ کو شکست ہوئی اور انگریز ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے گلی کوچوں میں دست بدست لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد بھی ۱۹ ستمبر تک ہوتی رہی، لیکن تابہ کے۔ آخر کار مقابلہ ختم ہوا اور شہر پر دوبارہ مکمل انگریزی قبضہ ہو گیا۔ مولانا نے اس زمانے کے حالات یوں قلمبند کیے ہیں[9]:-

> جب نصاریٰ (یعنی انگریزوں) کا شہر پر قبضہ ہو گیا، تو یہاں نہ دیسی فوج رہی، نہ کوئی شہری۔ نہ کھانے کو خوراک ملتی تھی؛ نہ پینے کو پانی۔ دشمنوں (یعنی انگریزوں) نے بھی ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیے ہیں پانچ دن رات تو شہر میں رُکا رہا۔ پھر خدا پر بھروسا کر کے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر چل کھڑا ہوا۔ اور چونکہ باربرداری کا سامان مہیا نہ تھا، اس لیے سارا ساز و سامان اور کتابیں اور مال وغیرہ بھی یہیں چھوڑا۔

اگر ہم خیال کریں کہ وہ ۱۴ ستمبر کے بعد پانچ دن یہاں رہے تو گویا اہل و عیال کے ساتھ وہ ۱۹ ستمبر کو یہاں سے روانہ ہوئے اور اگر یہ ۱۹ سے گنا جائے تو یہاں سے روانہ ہونے کی تاریخ ۲۴ ستمبر ہو گی۔ عدالت کے سامنے بیان میں انھوں نے کہا ہے کہ میں دہلی میں صرف پندرہ دن رہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۴ یا ۹ ستمبر کے قریب یہاں پہنچے ہونگے؛ حالانکہ منشی جیون لال کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۶ اگست کو دہلی میں موجود تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دن بہادر شاہ کے دربار میں شامل ہوئے اور انھوں نے نذر پیش کی[10]۔ عبداللطیف نے تاریخ ۱۹ اگست لکھی ہے، اگرچہ اس کے الفاظ

۹۔ ایضاً: ۳۷۸ - ۳۷۹

۱۰۔ غدر کی صبح شام: ۲۱۷ (مرتبہ خواجہ حسن نظامی۔ ہمدرد پریس دہلی۔ ۱۹۲۶ء)

سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے"

میرا اپنا خیال ہے کہ عدالت میں انھوں نے جو کچھ کہا، یہ غالباً ٹھیک نہیں۔ اگر انھوں نے الور سے روانگی کی تاریخ صحیح بتائی ہے، تو الور اور دہلی کی مسافت اتنی نہیں کہ اس زمانے کے غیر معمولی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی، اسے طے کرنے میں چار ہفتے لگ گئے ہوں۔ وہ ضرور اس سے بہت پہلے یہاں آ گئے تھے۔

بہر حال وہ وسط اگست ۱۸۵۷ء میں یہاں پہنچے ہوں یا ستمبر کے شروع میں، جیسا کہ مولانا عرشی اپنے مشارٌ الیہ مضمون میں ثابت کر چکے ہیں، جس فتوے میں اُن کی شمولیت پر اصرار کیا جاتا ہے وہ ان کے آنے سے بہت پہلے جولائی ہی میں شائع ہو چکا تھا؛ اس پر ان کے دستخط کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جب مولانا فضل حق اپنا بیان دے چکے، تو ان کی طرف سے مندرجہ ذیل پانچ صفائی کے گواہوں کی فہرست دی گئی ہے:

(۱) قادر بخش؛ (۲) نبی بخش خیر آبادی؛ (۳) علی محمد خان خیر آبادی؛ (۴) ممتو خان خیر آبادی؛ (۵) احمد علی خان لیکن افسوس کہ ان میں سے بعض اصحاب نے کسی مصلحت سے کچھ ایسی باتیں کہیں، جن سے ملزم کو فائدہ تو درکنار، عین ممکن ہے کہ کچھ نقصان ہی پہنچا ہو۔ سب سے پہلے قادر بخش حاضرِ عدالت ہوا۔ اس نے کہا:

مولوی فضل حق خیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ میں عدالت فوجداری پٹیالہ کا صدر تھا اور بغاوت شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلا آیا تھا۔ میں سیتا پور میں جلسہ ہونے سے دو ماہ پیشتر وہاں مقیم تھا۔ میری مولوی فضل حق سے کوئی رشتہ داری نہیں۔ یہ جب آخری مرتبہ خیر آباد واپس آئے ہیں، تو میں ان سے نہیں ملا تھا، بلکہ ان سے میری ملاقات ان کی واپسی کے کوئی سات مہینے بعد ہوئی اور پھر سیتا پور کے جلسے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی۔ یہ بیگم (حضرت محل) کے آنے تک وہیں

۱۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامہ ۹۶ (از عبداللطیف الجمعیۃ پریس۔ دہلی ۱۹۵۹ء)

مقیم رہے تھے۔ بیگم کے جانے کے بیس دن کے بعد میں سیتاپور سے چلا آیا۔ مولوی فضل حق بھی خیرآباد سے چلے گئے، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئے تھے۔ وہ میرے چلے آنے کے بعد وہاں سے گئے۔ کوئی دو مہینے ہوئے، میں واپس خیرآباد آگیا۔ اس سے پندرہ بیس دن بعد مولوی فضل حق بھی وہاں آئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس اثنا میں وہ کہاں رہے تھے۔

مجھے ان کے سابق حالات سے زیادہ واقفیت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سہارن پور میں سررشتہ دار تھے، لیکن کب اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ ٹامس مٹکاف کمشنر کے پاس بھی بطور سررشتہ دار ملازم رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ فضل الرحمن مہاراجہ پٹیالہ کے ملازم ان مولوی فضل حق کے بڑے بھائی ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ مولوی فضل حق، بیگم (حضرت محل) کے ملازم تھے۔ ایک اور فضل حق، سہارن پور کا رہنے والا تھا۔ وہ محمدی کا چکلہ دار تھا۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ فیروز شاہ (ابن بہادر شاہ ظفر) کے ساتھ چلا گیا تھا۔

میں نے نہیں سنا کہ ان مولوی فضل حق نے کسی شخص کو گمراہ کر کے اسے بغاوت پر آمادہ کیا ہو۔

صفائی کے دوسرے گواہ نبی بخش خیرآبادی کا بیان حسبِ ذیل تھا:

میں مولوی فضل حق کو بچپن سے جانتا ہوں۔ ان کے والد مولوی فضل امام تھے۔ وہ بھی دہلی میں انگریزی راج میں مفتی تھے۔ مولوی فضل حق بہت برس اپنے والد کے ساتھ دہلی میں رہے اور میں نے سنا ہے کہ یہ وہاں سررشتہ دار تھے اور سہارن پور میں بھی انگریزی ملازمت میں تھے۔ بغاوت سے پہلے یہ راجہ الور کے ملازم تھے۔ کوئی پندرہ مہینے ہوئے، جب یہ اپنے

وطن خیرآباد آئے۔ یہ دو مہینے کے لگ بھگ یہاں رہے اور پھر سے خیال میں لکھنؤ چلے گئے۔ جب انگریزوں نے لکھنؤ فتح کیا ہے، تو یہ واپس خیرآباد آئے اور دو تین مہینے یہاں رہے۔ میں نے پھر سنا کہ یہ ہرگاؤں گئے ہیں، جو خیرآباد سے دس کوس شمال میں ہے۔ اس کے بعد میں نے انھیں آج سے ڈیڑھ مہینا پہلے خیرآباد میں پھر دیکھا۔ میں نے نہیں سنا کہ یہ بریلی کے نواب (خان بہادر خان) یا بیگم (حضرت محل) کے ملازم رہے ہیں۔

ان کے دو بھائی زندہ ہیں فیضل الرحمٰن اور منظفر حسین فیضل الرحمٰن راجہ پٹیالہ کے ہاں ملازم ہے۔ منظفر حسین اجمیر میں فقیر (مجاور) ہے۔ میں نے نہیں سنا کہ مولوی فضل حق نے کسی کو گمراہ کر کے اسے باغی بنایا ہو یا خود انھوں نے خان بہادر خان کی ملازمت اختیار کر لی ہو۔

ہاں میں نے سنا ہے کہ ایک اور فضل حق شاہجہان پور کا رہنے والا تھا۔ وہ خان بہادر خان کا ملازم تھا اور فیروز شاہ کے ساتھ بھی گیا تھا۔

تیسرے صفائی کے گواہ علی محمد خان خیرآبادی تھے۔ انھوں نے یہ بیان دیا۔

ڈھائی برس ہوئے، جب مولوی فضل حق الور سے خیرآباد آئے۔ سیتا پور میں بغاوت کو دو برس ہوئے ہیں۔ مولوی فضل حق خیرآباد میں بغاوت کے بعد آئے تھے۔ اگرچہ میں ان دنوں رام پور میں تھا، لیکن ان کے یہاں آنے کے پندرہ روز بعد میں خیرآباد پہنچا۔ جب یہ رام پور سے گزر رہے ہیں، تو میں نے انھیں وہاں دیکھا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ چونکہ الور میں میری ملازمت جاتی رہی ہے اس لیے میں واپس وطن جا رہا ہوں۔ میں یہاں دو مہینے گھر پر رہا۔ اس زمانے میں یہ خیرآباد ہی میں تھے۔ اس کے بعد کا مجھے علم نہیں۔ کیونکہ میں ٹونک میں ملازم ہو گیا تھا۔ چھ مہینے بعد اہل وعیال کو لے جانے کے لیے

> میں گونڈہ سے خیرآباد آیا، تو انھی ایام میں مولوی فضل حق بھاگ کے ہرگاؤں چلے گئے۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

چوتھے گواہ ممّو خان خیرآبادی نے صرف اتنا کہا کہ:

> کوئی سال بھر ہوا، مولوی فضل حق پٹیالے سے خیرآباد آئے، جہاں وہ راجہ کے ملازم تھے۔ سیتا پور میں بغاوت ان کے آنے کے بعد ہوئی۔ ایک سال پہلے جب بیگم (حضرت محل) یہاں سے گئی ہے، تو مولوی فضل حق بھی خیرآباد سے بھاگ گئے۔

آخری گواہ احمد علی تھے۔ انھوں نے بس اتنا کہا کہ:

> میں نے سات مہینے ہوئے۔ مولوی فضل حق کو بونڈی میں دیکھا تھا۔ میں وہاں پانچ دن رہا۔ اس سے زیادہ کا مجھے علم نہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ان صفائی کے گواہوں کے بیان بھی آپس میں متفق نہیں۔ مثلاً نبی بخش خان کہتے ہیں کہ مولانا فضل حق کو خیرآباد آئے پندرہ مہینے ہوئے ہیں۔ علی محمد خاں یہ واقعہ ڈھائی برس پہلے کا بتاتے ہیں اور ممّو خان کوئی سال بھر کا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں عدالت ان میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتی۔

بہرحال ان پانچوں گواہوں میں سے پہلے دو یعنی قادر بخش اور نبی بخش نے جملہ واقعات کسی ایچ پیچ کے بغیر پوری صراحت اور جرأت سے بیان کیے ہیں۔ علی محمد خان کے بیان میں اگرچہ کوئی خاص بات مولانا موصوف کے خلاف نہیں تھی۔ لیکن اس کے ہاں ایک اہم مسئلے سے متعلق تضاد ہے۔ اس نے کہا کہ انھیں خیرآباد واپس آئے ڈھائی برس ہوئے ہیں اور یہ خیرآباد اور سیتا پور میں بغاوت شروع ہونے کے بعد یہاں آئے تھے۔ اتنی بات تو ان کے حق میں تھی۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ان کا شورش میں کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن اگلے سوال کے جواب میں اس نے کہہ دیا کہ وہاں بغاوت ہوئے دو برس ہوئے ہیں؛ گویا یہ ان کے وہاں پہنچنے کے بعد ہوئی۔ یہی بات اس گواہ کے بعد ممّو خاں خیرآبادی

نے بھی کہی۔ اس نے تصدیق کی کہ "سیتا پور میں بغاوت ان کے آنے کے بعد ہوئی"۔ آخری دونوں بیان سب سے کمزور بلکہ بے کار ہیں، اور چونکہ یہ صفائی کے گواہوں کے ہیں جن کی فہرست ملزم کی پیش کردہ تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ عدالت پر اس کا اثر مخالفانہ ہی ہو سکتا ہے۔

(۳)

کپتان تھر برن نے استغاثہ اور ملزم اور صفائی کے گواہوں کے بیانات لینے کے بعد ۲۸ فروری ۱۸۵۹ء کو مندرجہ ذیل فردِ جرم مرتب کی اور مقدمہ جوڈیشنل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔

فردِ جرم

۱۔ ملزم (مولوی) فضل حق نے مئی ۱۸۵۸ء میں بوندی کے مقام پر باغی سرغنہ ممّو خان کے مشوروں میں نمایاں حصّہ لیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود باغیوں کا سردار تھا اور لوگوں کو بغاوت پر اکساتا رہا۔

۲۔ مئی ۱۸۵۸ء میں بوندی کے مقام پر وہ لوگوں کو قتل پر اکساتا رہا۔ مثلاً اس نے باغی سرغنہ ممّو خان کو ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کے قتل کا مشورہ دیا۔

تشریح

فروری ۱۸۵۸ء میں باغیوں نے ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو گرفتار کر لیا اور اسے بیگم اور ممّو خاں کے پاس لے گئے جو ان دنوں قلعہ بوندی کے اندر اور اس کے گرد و نواح میں پڑاؤ ڈالے تھا۔ عبدالحکیم کے ساتھ ہی ایک اور شخص مرتضیٰ حسین بھی گرفتار ہوا تھا، جو اگرچہ سرکاری ملازم تو نہیں تھا لیکن چونکہ وہ انگریزوں کا خیرخواہ تھا، اس لیے باغیوں کی آنکھ میں کھٹکتا تھا۔ جب یہ دونوں شخص ممّو خاں کے سامنے پیش ہوئے، تو ملزم نے جو وہاں موجود تھا قرآن کی آیتیں پڑھیں اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ دونوں موت کے سزاوار

ہیں۔ شہادت سے ثابت ہے کہ فضل حق ملزم کا ممو خان پر بہت اثر تھا؛ یہ اس کے مشیر تھے اور اس حیثیت سے باغی فوج میں گویا سرغنہ تھے۔ انھوں نے ممو خان پر اپنے اثر و رسوخ کو عبد الحکیم اور مرتضیٰ حسین کے خلاف استعمال کیا۔

اگرچہ ان دونوں نے بعد کو قید سے رہائی حاصل کر لی، لیکن یہ فضل حق کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ہوئی۔ یعنی جب باغی سرغنے (ممو خاں) نے انھیں مولوی احمد اللہ شاہ کی جائداد ضبط کرنے کو بھیج دیا تھا۔

اس پر مقدمہ کے جملہ کوائف، گواہوں کے بیانات اور کپتان بطر برن کی تحریر کردہ فرد جرم جو ڈپٹنل کمشنر (اودھ) مسٹر جارج کیمبل (G. CAMPBELL) اور میجر بارو BARROW قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوئی، انھوں نے ۴۔ مارچ ۱۸۵۹ء کو یہ فیصلہ صادر کیا۔

مولوی فضل حق پر الزام یہ تھا:

الزام: بغاوت اور قتل پر انگیخت

تشریح: (۱) وہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران میں بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔

تشریح (۲) اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے ممو خاں کی مجلسِ مشاورت میں نمایاں حصّہ لیا۔

تشریح (۳) اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک سرکاری ملازم عبد الحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی۔

ملزم نے جرم سے انکار کیا اور سماعت شروع ہوئی۔

عدالت کے سامنے ملزم مندرجۂ ذیل امور میں مجرم ثابت ہوا۔

۱۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔

۲۔ ۱۸۵۸ء میں بوندی کے مقام پر اس نے باغیوں کے، جو وہاں پڑاؤ ڈالے جمع تھے اور بالخصوص باغی سرغنے ممّو خاں کے مشوروں میں خاص سرگرمی دکھائی۔ ان ہی ایام میں اس نے ایسے فتوے دیے جن کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔

۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو اسے بطور شاہی قیدی حبسِ حیات حبس بعبورِ دریائے شور اور اس کی تمام جایداد کی ضبطی کی سزا دی گئی۔

نقل فیصلہ

ملزم کے مقدمہ کے دو پہلو ہیں۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ وہ اودھ کے باغی سرغنہ کا مشیر تھا۔ لیکن اس کی گرفتاری کے بعد دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں کے حکام سے بھی اس سے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو حالات تحریر کیے، ان سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی تھیں۔ لیکن جہاں تک قیام دہلی کے زمانے میں اس کے چال چلن کا تعلق ہے، وہاں کے گواہ عدالت کے سامنے نہیں، نہ ملزم کو ان گواہوں پر جرح کرنے اور عائد کردہ الزامات کی جوابدہی کا موقع دیا گیا ہے۔ البتہ جہاں تک اودھ کا تعلق ہے اگر یہ مقدمہ ثابت ہو جائے، تو پھر ملزم کے عام چال چلن اور رویّے کے لیے دہلی کی شہادت بھی تائیدی اور توثیقی حیثیت سے تسلیم کی جاسکتی ہے۔

اس پر الزام یہ لگائے گئے ہیں:

اول۔ پوری بغاوت کے دوران میں بالعموم لوگوں کو بھڑکانا، اور

دوم۔ ۱۸۵۸ء میں بالخصوص اودھ میں بغاوت پر اکسانا۔

اس امر کی قوی شہادت موجود ہے کہ ایک موقع پر اس نے قتل کی شہہ دی، جو براہِ راست قتل کے مرادف تھی۔ لیکن چونکہ جن اشخاص کے

قتل کی کوشش کی گئی تھی، وہ واقعی قتل نہیں کیے گئے تھے، اس لیے عدالت نے ملزم کے خلاف یہ جرم تسلیم نہیں کیا؛ بلکہ اس بات کا بھی یقین نہیں کہ انجام کار ملزم نے ان اشخاص کی رہائی کے لیے بھی اپنی رضامندی کا اظہار نہ کردیا ہو۔

بہرحال عدالت کی نظر میں یہ ثابت ہے کہ اس موقع پر ملزم نے بلا ضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر او رمرتد ہیں؛ اور اس لیے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے۔ بلکہ اس نے باغی سرداً سے یہاں تک کہا کہ اگر تم انھیں قتل نہیں کرتے، تو خود خدا کی نظر میں مجرم ہو۔ ہم نے اس شبہے کا فائدہ ملزم کو دیا ہے کہ ممکن ہے اس نے اس خاص موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا، ان سے اس کا مقصد یہ ہو کہ یہ اشخاص انگریزی ملازمت ترک کرکے باغیوں کے ساتھ مل جائیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسے متعقدات (فتووں) کا اصلی مقصد قتل کی ترغیب دینا ہے جس کی متعدد مثالیں اس بغاوت کے دوران میں ملتی ہیں۔

دہلی میں بھی اس کا یہی کام تھا اور ادھر میں بھی اس نے اپنی یہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس نے مقدمے کے دوران میں ایک موقع پر یہ صفائی پیش کی تھی کہ اودھ میں دو مشہور فضل حق ہیں۔ لیکن یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ وہ دوسرا شخص سابق میں ضلع بریلی کا تحصیلدار تھا اور پچھلے ایام میں جبکہ دار او رباغیوں کا سرغنہ رہا ہے۔ لیکن ملزم تو کبھی صاحب سیف رہا ہی نہیں؛ بلکہ اس کی ہمیشہ صاحب رائے و مشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے اور وہ بونڈی کے مقام پر باغیوں کی مجلس شوریٰ (پریوی کونسل) کا اہم رکن تھا۔ یہ بات مشکوک ہے

کہ آیا ملزم کسی باقاعدہ عہدے پر فائز تھا، یا اس مجلس شوریٰ کی کوئی رسمی حیثیت بھی تھی یا نہیں، لیکن اس سے متعلق تو کوئی شبہ نہیں اور یہ بات ان ایام میں خاص طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیران خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی "اربعہ شوریٰ" کے نام سے شہرت تھی، بلکہ کبھی کبھی انھیں "کچہری پارلیمنٹ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم بہت ممتاز تھا۔

یہ بات بھی قطعی شہادتوں سے ثابت ہو گئی ہے کہ ملزم سردار ممّو خاں کا خاص معتمد علیہ تھا اور وہ اکثر ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا، جیسا کہ اس موقع پر بھی ہوا جب اس نے قتل کا فتویٰ دیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے لیکن جس طرح اور پر بیان ہوا اس نے بے ایمانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لیے انصاف اور امنِ عامّہ کا یہ تقاضا ہے کہ اُسے ملک بدر کر دیا جائے۔

وہ اودھ کا باشندہ ہے اور ایک ایسے خاندان کا فرد ہے، جو انگریزی حکومت کا ساختہ پرداختہ ہے بلکہ ایک زمانے میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت میں اچھے بڑے عہدے پر متمکن تھا۔ لیکن گزشتہ کئی برس سے وہ انگریزی ملازمت ترک کر کے اودھ، رام پور، الور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا ہے۔ اس کی ہمیشہ بہت شہرت رہی ہے۔ جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ بھی مولوی فضل حق کا نام اکثر سنتے آئے تھے۔ بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ و دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم

چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندستان سے خارج کر دینا چاہیے۔

ملزم کے بڑھاپے اور سماج میں اس کی نمایاں حیثیت اور اودھ کا باشندہ ہونے اور اس کے سرکار انگریزی کا نہیں، بلکہ گذشتہ کئی برس سے دیسی ریاستوں کا ملازم ہونے کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ اس سے عام قیدی کی جگہ سیاسی قیدی کا سا سلوک کیا جائے۔

۴

چونکہ فوجی عدالت کے فیصلوں سے متعلق یہ قاعدہ ہے کہ ان کے خلاف مرافعہ (اپیل) نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بالعموم تصدیق کے لیے حکامِ بالا کے پاس بھیج دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ جوڈیشنل کمشنر کی عدالت سے مولانا فضلِ حق کے مقدمے میں جو فیصلہ ہوا تھا، اسے بھی تصدیق کے لیے گورنر جنرل باجلاسِ کونسل کی خدمت میں سکلتے بھیج دیا گیا۔ جب مولانا کو معلوم ہوا کہ ابھی امید ہے کہ شاید اس میں تبدیلی کرائی جا سکے، تو انھوں نے اپنے وکلا مسرز سون ہو بیبی اینڈ لیزلی SWINHOE BEEBY AND LESLIE کی وساطت سے گورنر جنرل کی خدمت میں یہ التماس کی کہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور جوڈیشنل کمشنر کا فیصلہ رد کیا جائے۔ جب اس پر جواب ملا کہ کمشنر کے فیصلے کی تصدیق کر دی گئی ہے تو انھوں نے پھر حسبِ ذیل درخواست پیش کی[۱۲]۔

درخواست بحضور جناب ارل کیننگ۔ جی، سی، بی وائسرائے و گورنر جنرل باجلاسِ کونسل

میرے خلاف جو مقدمہ چلایا گیا ہے اور اس میں جو فیصلہ ہوا ہے اور جو سزا مجھے دی گئی ہے، حضور ملکۂ معظمہ کے عام معافی کے اعلان کے

۱۲۔ قومی دفتر خانہ ہند، نئی دہلی۔ فارن، پولیٹیکل، دسمبر ۱۸۶۰ء (نمبر ۵۵)

NATIONALE ARCHIVES OF INDIA

خلاف ہے۔

۱۔ مجھ پر "بغاوت اور قتل کی ترغیب" کا الزام لگایا گیا ہے۔ لیکن شاہی اعلان نے یہ تمام جرم معاف کر دیے ہیں۔ اس لیے اگر بفرض محال یہ خیال بھی کر لیا جائے کہ بہ فدوی ان جرائم کا مرتکب ہوا تھا جب بھی اس اعلان شاہی کی موجودگی میں مجھ پر جو مقدمہ چلایا گیا ہے اور جو سزا دی گئی ہے یہ خلاف قانون ہے۔ اعلان نے عام معافی سے صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا ہے جنھوں نے براہ راست برطانوی رعایا کے قتل میں حصہ لیا یا قاتلوں کو پناہ دی۔ یا وہ لوگ جو بغاوت کے سرغنہ تھے یا جنھوں نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔ میں ان میں سے کسی جرم کا بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ مرتکب نہیں ہوا۔

۲۔ میرے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ میں باغیوں کا سرغنہ تھا اور میں نے انھیں بغاوت کی ترغیب دی۔ لیکن سپیشل کمشنر نے جو فیصلہ صادر کیا ہے، اسی سے اس الزام کی تغلیط ہو سکتی ہے۔ اس میں انھوں نے متضاد باتیں بیان کی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ملزم (یعنی میں) باغیوں کا مشیر کار اور بغاوت کا سرگرم ترغیب دینے والا تھا۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب بغاوت شروع ہوئی تو ملزم الور میں ملازم تھا؛ لیکن بعد کو وہ خود بخود دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا۔

مشیر کو بغاوت کی ترغیب دینے والا کہنا، لفظوں کو غلط معنی پہنانا ہے؛ اور جو شخص محض باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا ہے، اسے ترغیب دینے والا کہنا علت و معلول کو بالعکس کر دینے کے مرادف ہے۔

۳۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سپیشل کمشنر نے بیان کیا، میں ریاست الور میں ملازم تھا اور دہلی میں بغاوت شروع ہونے کے چار مہینے بعد

اپنی بیوی کو وہاں سے نکالنے کے لیے آیا۔ میں بیوی کو ساتھ لے کر اپنے وطن خیر آباد چلا گیا اور مئی ۱۸۵۸ء میں احمد اللہ کے ظلم و ستم سے جان بچانے کی خاطر بھاگ کر لونڈی گیا۔ اس کے بعد مسیح الزماں نے مجھے پکڑ کر قید کر دیا، کیونکہ میں نے اس کے ساتھ بغاوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ مسیح الزماں جو باغیوں کا سرغنہ تھا، وہ تو آزاد دندناتا پھر رہا ہے، اور میں جس کا جرم صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ میں نے باغیوں کو مشورہ دیا، باوجودیکہ خود بعض باغیوں نے مجھ پر ظلم توڑے تھے، مجھے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔

۴۔ سزا کے خلاف قانون ہونے کا ثبوت خود اسی فیصلے میں موجود ہے، جو سپیشل کمشنر نے میرے مقدمہ میں دیا ہے۔ لکھا ہے وہ بہت ہی خطرناک آدمی ہے اور کسی وقت بھی انتہائی نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے انصاف اور امنِ عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فدوی کو سزا اس لیے نہیں دی گئی کہ میں نے کوئی جرم کیا ہے، بلکہ مجھے ملک بدر اس لیے کرنا چاہیے تاکہ میں کبھی نقصان پہنچانے کے قابل نہ رہوں۔ اگرچہ یہ سمجھنا محال ہے کہ میرے جیسا پیرانہ سال شخص نقصان ہی کونسا پہنچا سکتا ہے سپیشل کمشنر اس لیے مقرر ہوئے تھے کہ وہ ان لوگوں کے مقدمات کی سماعت کریں، جن کے جرائم ملکۂ معظمہ کے اعلانِ معافی سے مستثنیٰ کیے گئے تھے۔ فدوی کسی ایسے جرم کا مرتکب نہیں ہوا اگرچہ سپیشل کمشنر نے مجھے سزا اس جرم کی دی ہے کہ میں نے لوگوں کو بغاوت کی ترغیب دی تھی لیکن خود ان کی اپنی رائے یہ بھی ہے کہ میں باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا یا زیادہ سے زیادہ میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں نے بعض سرغنوں کو مشورہ

اور صلاح دی، جو اعلانِ شاہی کے مطابق بہت خفیف جرم ہے۔
لیکن میں نے ان کے فیصلے سے جو فقرے نقل کیے ہیں، اُن سے اُن کا اصلی مدعا واضح ہو جاتا ہے یعنی وہ مجھے ملک سے باہر اس لیے بھیجنا چاہتے ہیں کہ میرا چال چلن ٹھیک رکھنے کی یہی ایک ضمانت ہے۔

۵۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مقدمہ، اس کی کارروائی اور اس میں جو سزا دی گئی ہے، یہ سب کچھ ملکۂ معظمہ کے اعلان کے خلاف بلکہ قانون اور انصاف ہی کے خلاف تھا، تو کیا حضور والا اس کی حمایت کرینگے؟ اور یہ کس لیے؟ تاکہ ایک مُسِن شخص اپنے خاندان سے دُور مرنے کو بھیج دیا جائے، اور اس کے خاندان کو اس آذوقہ سے محروم کر دیا جائے، جو ان کی زیست کا سہارا ہے۔

۶۔ جب میں نے میسرز شون ہو، بیبی اینڈ لیزلی کی وساطت سے درخواست پیش کی، تو مجھے مطلع کیا گیا کہ میرے مقدمے پر باجلاس کونسل غور کرنے کے بعد سپیشل کمشنروں کے فیصلے کی تصدیق کر دی گئی ہے۔
اگرچہ جو سرکاری جواب مجھے ملا ہے، اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا، تاہم مجھے یقین ہے کہ سپیشل کمشنروں کے فیصلے کا بہت غور اور توجہ سے مطالعہ کیا گیا ہوگا۔ بہر حال اس سے ایک بات تو واضح ہے کہ جب ان کے فیصلے کی تصدیق میری درخواست موصول ہونے سے پہلے ہی کر دی گئی تھی، تو اس میں جو دلائل میں نے پیش کیے تھے، ظاہر ہے کہ ان پر غور نہیں کیا گیا۔
اس لیے اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر رئیس اسپشل کمشنروں کے فیصلے کے خلافِ قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے، اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق، انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور

اس کے متعدد بے بس افرادِ خاندان پر رحم کو مدِ نظر رکھا جائے، بہر حال
میری رہائی اور مختصر جاداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائینگے۔

اس دوسری درخواست سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا اور سزا بحال رہی؛ البتہ گورنر جنرل نے، معلوم ہوتا ہے، یہ حکم صادر کیا کہ ان سے مشقت نہ لی جائے، نہ ان کے بڑھاپے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان سے کسی طرح کی سختی کا سلوک کیا جائے۔ اس پر جوڈیشیل کمشنر نے مئی ۱۸۵۹ء میں ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کو ہدایت دی کہ اب اس سزا کا حکم نافذ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل میں انھیں کالے پانی (جزیرۂ انڈیمان) بھیجنے کے لیے لکھنؤ سے کلکتہ منتقل کیا گیا۔ ان ایام کی کہانی خود مولانا کی زبانی سنیے۔ اپنے عربی نثری رسالے "ثورۃ الہندیہ" میں لکھتے ہیں[۱۴]:

جب نصاریٰ نے مجھے دھوکے اور فریب سے قید کر کے ابتلا میں مبتلا کیا، تو پہلے ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے کو اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین کو منتقل کرتے رہے۔ انھوں نے مجھے الم پر الم اور غم پر غم پہنچائے۔ میرے جوتے اور لباس اتروا لیا اور ان کی جگہ موٹے جھوٹے اور کھردرے کپڑے پہنا دیے۔ مجھ سے نرم اور آرام دہ بستر چھین لیا اور اس کی جگہ تکلیف دہ اور سخت بستر دے دیا، جو گویا کانٹوں کا بچھونا یا انگاروں کا بستر تھا۔ انھوں نے میرے پاس لوٹا پیالا یا کوئی اور برتن نہیں چھوڑا۔ وہ مجھے کھانے کو ارہڑ کی دال اور پینے کو گرم پانی دیتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں براہِ راست کلکتہ نہیں لے گئے تھے بلکہ مختلف جیلوں میں رکھتے ہوئے آخر کار کلکتہ پہنچایا گیا تھا۔

(۵)

غالبؔ کے مولانا فضل حق سے ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات رہے تھے۔ ان کے

۱۴۔ باغی ہندوستان: ۴۳۰۔ ۴۳۱

فارسی نظم و نثر کے مجموعوں میں اس کے متعدد ثبوت موجود ہیں۔ جس زمانے میں مولانا زیرِ حراست کلکتہ پہنچے ہیں، میرزا کے ایک اور مصیبت زدہ عزیز دوست ناظر حسین میرزا اور ان کے بھانجے یوسف میرزا بھی کلکتے میں موجود تھے۔ یوسف میرزا نے غالب کو ان کے حال کی اطلاع دی ہوگی۔ اس پر مرزا غالب نے یوسف میرزا کو لکھا[۱۴]:

> مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا؟ کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکمِ دوامِ حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائیگا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے! جو ہونا تھا، سو ہولیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

میرزا کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً مولانا فضل حق کے فرزندِ اکبر مولانا عبدالحق نے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے فیصلے کے خلاف وزیرِ ہند کی خدمت میں مرافعہ پیش کیا تھا یا کرنے والے تھے۔ لیکن بہرحال ظاہر ہے کہ اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

جب تک انڈیمان کے لیے جہاز کا انتظام نہیں ہوسکا، مولانا کو یہاں کلکتے میں علی پور جیل میں رکھا گیا تھا۔ جب شہر کے معززین کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے طور پر مندرجۂ ذیل درخواست تیار کر کے حکومت کی خدمت میں روانہ کی[۱۵]:

> "بحضور رائٹ آنریبل گورنر جنرل ہند باجلاس کونسل، کلکتہ اور اس کے مضافات اور اضلاع کے دستخط کنندگان کی درخواست
>
> ہم درخواست کنندگان نہایت ادب سے یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ مولانا فضلِ حق (انور کے رہنے والے) جنھیں سپیشل کمشنر اودھ نے سزا دی ہے اور جو حبسِ دوام بعبورِ شور کے قیدی کی حیثیت سے

۱۴۔ اُردوئے معلیٰ: ۲۴۹ (کریمی پریس، لاہور ۱۹۲۲ء)

۱۵۔ قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی۔ خارجی، پولیٹیکل ستمبر ۱۸۶۰ء نمبر ۵۵۸

علی پور قید خانے میں لائے گئے ہیں، محض بیگناہ آدمی ہیں اور ہم ان کے صحیح حالات بیان کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کی سخت سزا انھیں دی گئی ہے، وہ کسی طرح اس کے مستحق نہیں کیونکہ وہ نہ تو قاتل ہیں نہ باغی، نہ انھوں نے لوگوں کو بغاوت پر بھڑکایا، نہ انھیں اپنے ہاں پناہ دی، نہ ان کی ملازمت میں رہے۔ اودھ کے حکام نے بھی ان میں سے کوئی الزام ان پر نہیں لگایا، نہ کوئی ایسی بات ہی وہ ان کے خلاف ثابت کر سکے ہیں، نہ صرف یہ، بلکہ وہ تو یہ بھی ثابت نہیں کر سکے کہ یہ وہی فضل حق ہیں، جو اس سے پہلے تحصیلدار رہا تھا؛ اور بغاوت کے آغاز کے زمانے میں چکلہ دار تھا۔ اس کے بالعکس یہ پوری طرح ثابت ہو گیا ہے کہ ان مولانا فضل حق کا بلاواسطہ یا بالواسطہ، بغاوت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ الور میں تھے؛ اور شورش کے شروع ہونے کے چار مہینے بعد اپنے اہل وعیال کو دہلی سے ساتھ لے کر اپنے وطن خیرآباد چلے گئے؛ اور جب تک انگریزی تسلط اودھ پر دوبارہ قائم نہیں ہو گیا اور باغی وہاں سے فرار نہیں ہو گئے، یہ وہیں مقیم رہے۔ اور جب خیرآباد کے متعدد باشندے اپنی جان اور ناموس کو بچانے کی خاطر وہاں سے بھاگ گئے، تو مولانا فضل حق نے بھی ان کا تتبع کیا۔ جب شاہی اعلان کے ذریعے عام معافی کا اعلان ہوا اور لوگ مقررہ میعاد کے اندر حاضر ہونے لگے، تو وہ بھی فوجی افسر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور اس کی اجازت سے اپنے مکان پر رہنے لگے۔ اس کے بعد انھیں یہاں سے گرفتار کیا گیا اور اگرچہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا، اس کے باوجود محض شبہات کی بنا پر انھیں ایسی سخت سزا دی گئی ہے۔

اس سزا کی ایک اور وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ حکام کی نظروں میں وہ بہت ذہین اور قابل شخص ہیں۔ ہم حضورِ والا کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ کبیر السن ہیں۔ ستر برس کے لگ بھگ؛ اور اگرچہ وہ بیشک بہت قابل شخص ہیں، لیکن ان کی ساری قابلیت صرف ایک بات یعنی علومِ شرقیہ کی تعلیم میں محدود ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ واقعی عقلمند اور قابل ہیں، تو یہ عقل سے قطعی بعید ہے کہ کوئی شخص حکامِ وقت کے خلاف کھڑا ہو جائے جن کی طاقت اور تسلط یقینی اور مسلمہ ہے۔ وہ نہ صرف بوڑھے اور کمزور ہیں بلکہ وہ اکثر مختلف بیماریوں کا شکار رہتے ہیں اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی مرض ان کے لاحق رہا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ کسی خطرناک اقدام کے لیے انھیں فرصت ہی کب ملی ہو گی!

ہم درخواست کنندگان کی نہ قیدی سے کوئی رشتہ داری ہے، نہ تعلق؛ گو ہم میں سے بعض یا ان کے شاگرد ہیں، یا ان کے شاگردوں کے شاگرد۔ لیکن چونکہ بے شبہہ وہ قابلِ احترام اور بےگناہ شخص ہیں اور ان کا ان الزامات سے کوئی واسطہ نہیں جو ان کے خلاف عائد کیے گئے ہیں؛ اس لیے ہم حضورِ والا کی خدمت میں یہ التماس کرتے ہیں کہ یا تو انھیں رہا کر دیا جائے جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں؛ یا انھیں بنگال کے کسی ضلع ہی میں قید کر دیا جائے، یا پھر مکّہ کو ہجرت اور حج کی اجازت مرحمت ہو۔

(دستخط) مولوی فضل الرحمٰن قاضی القضاۃ کلکتہ
حاجی محمد صدیق از عمایدِ کلکتہ
(اس طرح ڈیڑھ سو اصحاب کے دستخط ہیں)

لیکن افسوس کہ یہ سعی بھی رائیگاں گئی اور حکومت نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا۔

(۶)

آخر کار انھیں کلکتے سے فایر کوین (FIRE QUEEN) نامی جہاز پر سوار کر کے سمندر پار انڈیمان بھیج دیا گیا، جہاں اس زمانے میں تمام عمر قیدی بھیجے جاتے تھے۔ ان کا جہاز ۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا۔ یہاں ان کا قیدیوں میں دفتری نمبر (۳۶۰۷) تھا۔

انڈیمان کی آب و ہوا اور حالت جیسی کچھ ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر یہ آج اتنی خراب ہے تو آج سے سوا سو سال پہلے جو حال ہوگا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مولانا فضل حق کو اپنے اہل و عیال سے مفارقت کا خیال ہونا ہی چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ بیگناہ سزایاب ہوئے تھے۔ وہ ناز و نعم میں پلے تھے، ساری عمر اچھے اچھے عہدوں پر با عزت بسر کی تھی۔ اب یہاں موٹا جھوٹا کھانا اور موٹا جھوٹا پہننا پڑا۔ یہ انقلاب روزگار انھیں کیوں شاق نہ گزرتا!

یہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنی سرگزشت عربی نظم و نثر میں قلمبند کرنا شروع کی۔ اسے انھوں نے فروری ۱۸۶۰ء میں مکمل کیا اور پھر ان تحریروں کو کسی طرح اپنے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس بھیج دیا۔ ان میں ایک قصیدۂ ہمزیہ ہے؛ اس میں انھوں نے جزیرہ کی آب و ہوا اور زندگی کی کیفیت اور اپنے حزن و ملال کا تفصیلی حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے:[۱۶]

> مجھ پر ظلم ہوا ہے کہ مجھے اچانک میرے اہل و عیال اور وطن سے دور پھینک دیا گیا ہے، حال آنکہ میری اولاد ابھی کمزور اور کمسن ہے۔ وہ بھی ظلم سے اپنے گھر سے نکال دیے گئے ہیں۔ اب ان کے پاس نہ سکونت کی جگہ ہے نہ سکینت کا ٹھکانا۔ وہ فقیر و قلاش بن گئے ہیں کیونکہ ان کے پاس نہ مکان ہے نہ روزی، نہ کوئی اور شے۔ میں ان سے جدا ہوا ہوں تو وہ فاقوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی ساز و سامان تھا، نہ مال و دولت۔ عزیز و اقربا نے بیگانوں کی طرح ان سے پہلوتہی کی؛

۱۶- باغی ہندوستان: ۴۴۴ - ۴۴۵

اور ان کے برابر کے ملنے والوں نے ان پر ظلم کیا۔ اب قید و بند میرے اور میرے خاندان اور اقارب کے درمیان حائل ہے۔ اب یہاں دوست کی جگہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ اب نہ میرے احوال کی خبر میری اولاد تک پہنچ سکتی ہے، نہ اُن کی خبر مجھے۔ میں اقارب و احباب کی جدائی پر نالاں و گریاں ہوں؛ اور اُن کی قسمت میں بھی میری جدائی میں نالہ و بکا کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اگر میرے لیے آنسو بہائیں تو جائز ہے کیونکہ موت اور ذلیل قید خانے میں زندگی کے دن گزارنا ایک برابر ہے۔ مجھے اس بیابان جنگل میں لاکے رکھ دیا ہے، جہاں درو وحشیوں۔ کوتوں اور اجنبیوں کے سوا اور کوئی شے نظر نہیں آتی۔ یہاں کی آب و ہوا ناخوشگوار اور وبائی ہے۔ کھانا ایسا ہے کہ اس سے طبیعت سیر نہیں ہوتی اور پانی ایسا کہ اس سے پیاس نہیں بجھتی۔ پانی ملتا ہے تو گرم جس سے طبیعت میں طراوت پیدا نہیں ہوتی، کھانا ہے تو اڑد کی دال، جس میں ذائقہ نہیں۔

غرض یہاں میٹھا پانی ہے، نہ لذیذ کھانا، نہ کھلی فضا۔ میری طبیعت میں میرے جسمانی عوارض۔ فتق اور قولنج اور دانے اور اضافہ کر دیا ہے۔

مجھے راحت و عافیت کے فقدان کا رنج تو ہے ہی، لیکن ان مصائب نے اور یہاں کی ناخوشگوار آب و ہوا نے تو گویا مجھے ختم ہی کر دیا

اسی طرح اپنی گزشتہ[۱۰] خوش بختیوں اور عیش و عشرت کی زندگی کو یاد کر کے روتے ہیں اور آخر میں دُعا کرتے ہیں!

اے میرے خدا! میری امید بَر لا اور مجھے دشمنوں کے پنجے سے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما۔

۱۰- باغی ہندوستان، ۴۵۵ - ۴۵۷

میں سستی گاموں کو بڑھاتے میں کوشاں رہا، لیکن افسوس کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو خود اس میں بڑھ کے حصہ لینے کی جگہ پیچھے بیٹھ رہا۔
میں نے اس موقع پر کمزوری دکھا کے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔ خوش قسمت لوگ شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئے، لیکن میں اس سے محروم رہا۔
خدایا! میرے کیے کو معاف کر دے، مجھے بخش دے! مجھے تجھ سے عفو درگزر ہی کی توقع ہے۔
بیشک میرے گناہ بہت ہیں، لیکن تیری رحمت بھی تو اتنی وسیع ہے کہ اس کی حد ہے نہ انتہا۔
پس مجھے بخش دے اور معاف فرما؛ اور دشمنوں اور تہمت لگانے والوں نے مجھے جس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے اس سے نجات دے!
اور اگر یہ مصیبت، جس کی میں شکایت کر رہا ہوں، تیری طرف سے مقدر ہے، جب بھی تو مظلوم کی دعا سے تو اسے ٹال سکتا ہے۔
مظلوم تجھے نہ پکارے، تو اور کیا کرے۔ تو اس کی سن، انگفّار نے اس پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔
ان کی مسلسل سختیوں اور تہمتوں اور رسوائیوں نے میری جان عذاب میں کر دی ہے۔

غرض اسی طرح زار نالیوں سے خداوند تعالیٰ سے رحم کی دعائیں کرتے ہیں کہ کسی طرح اس جلا وطنی سے رہائی اور مخلصی نصیب ہو۔

(۷)

وہ یہاں کالے پانی پہنچنے کے بعد بھی ہمت نہیں ہارے اور انھوں نے ایک اور کوشش حکام سے دادرسی کی کی۔ ہندوستان میں وہ گورنر جنرل سے اپیل کر کے ناکام ہو ہی چکے تھے؛ اب انھوں نے ۹ جنوری ۱۸۶۰ کو مندرجہ ذیل درخواست وزیر ہند کی خدمت

میں ولایت بھیجی:[۱۸]

درخواست بنام وزیرِ ہند

۱۔ مجھے ملکہ معظمہ کے اعلان معافی کے خلاف حبسِ دوامی بعبورِ دریائے شور اور ضبطی جاداد کی سزا دی گئی ہے۔ میں نے ہندوستان میں تمام حکام مجاز کی خدمت میں انصاف کی، یا کم از کم میری عمر کا خیال رکھتے ہوئے رحم کی درخواست کی، لیکن بےسود۔ اب میں اپنے آپ کو دادرسی کے لیے آپ کے قدموں میں ڈالتا ہوں۔

۲۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا اور صرف سپشل کمشنر کے فیصلے کی اور حکومت ہند سے اپنی درخواست کی نقلیں ملفوف کرتا ہوں۔ انکی سے معلوم ہو جائیگا کہ مجھ پر مقدمہ چلانے، میرا جرم ثابت کرنے اور پھر مجھے سزا دینے میں حضور ملکہ معظمہ کے اعلان کے منشا کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک درخواست کی نقل بھی بھیج رہا ہوں، جو کلکتہ کے متقدر مسلمانوں نے حکومت ہند کی خدمت میں میری رہائی کے لیے دی تھی۔ میں ذیل میں مختصراً چند باتیں بیان کر دیتا ہوں، تاکہ میرے معاملے کی نوعیت واضح ہو جائے۔

۳۔ جیسا کہ سپشل کمشنر نے بھی اپنے فیصلے میں ذکر کیا ہے، میرا خاندان اپنی دنیوی حیثیت کے لیے بہت حد تک سرکارِ انگریزی کا مرہون منت ہے۔ ایک زمانے میں خود میں بھی انگریزی ملازمت میں بہت اچھے عہدے پر متمکن تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں انگریزی حکومت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب شورش کا آغاز ہوا ہے، میں ریاستِ الور میں ملازم تھا۔ میں اس کے چار مہینے بعد دہلی گیا، تاکہ وہاں سے اپنی بیوی کو نکال لاؤں، جو

۱۸۔ قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی۔ فارن پولیٹکل۔ ستمبر ۱۸۶۰ء، نمبر ۵۵۶

خطرے میں گھر گئی تھی۔ میں اسے ساتھ لے کر اپنے وطن خیر آباد چلا گیا اور مئی ۱۸۵۸ء تک وہاں رہا۔ وہاں سے ہمیں ایک شخص امداللہ شیخ کے تشدد و مجرمانہ کی بدولت بھاگ کے بونڈی جانا پڑا، وہاں ہماری جان خطرے میں تھی۔ بونڈی میں دو شخص ____ عبدالحکیم اور تفضل حسین میرے خلاف ہو گئے؛ یہ دونوں شیعہ تھے۔ مجھے نقصان پہنچانے کی خاطر ان دونوں نے بیان دیا کہ انھوں نے سنا تھا کہ میں ممو خان اور دوسرے باغیوں کے مشوروں میں شامل تھا اور قتل کے جواز کے فتوے دیتا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب ہم بھاگ کر بونڈی آ رہے تھے تو ایک باغی سرغنے مسیح الزماں نے ہمیں راستے میں گرفتار کر لیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت سختی کا سلوک کیا اور ہمیں کھیڑی میں نظر بند کر دیا۔ خوش قسمتی سے کھیڑی کے باشندے مجھے جانتے تھے؛ ان لوگوں کے کہنے پر مسیح الزماں نے ہمیں رہا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اگر کسی طرح کا میرا باغیوں سے تعلق پیدا ہوا ہے تو میری مرضی کے خلاف تھا۔

ملکۂ معظمہ کے آخری اعلان میں آخری تاریخ دسمبر ۱۸۵۸ء مقرر کی گئی تھی۔ اس میعاد کے گزرنے سے پہلے ہی میں سیتاپور کے اعلیٰ فوجی افسر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان سے اس معافی کی سند بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد میں انھیں کی زیر ہدایت اپنے مکان پر خیر آباد چلا آیا اور یہاں پہنچ کے میں نے وہ سند خیر آباد کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل کرا دی۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں مجھے زیر حراست لکھنؤ لائے اور یہاں مجھ پر مقدمہ قائم ہوا اور مارچ میں میرے خلاف فیصلہ ہوا۔ میں نے اس سلسلے میں جو درخواست حکومت ہند میں پیش کی تھی، اس سے اس فیصلے کی غلطی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی نقل لف ہذا ہے۔

۴۔ جب میں نے چیف کمشنر سے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی تو مجھے، اپریل ۱۸۵۹ء کو اطلاع ملی کہ وہ اپیل کی سماعت نہیں کر سکتے، بلکہ مقدمہ اس سے پہلے ہی حکومت ہند کے پاس بھیجا جا چکا ہے۔ اس پر جب میں نے اپنی اپیل حکومت کو بھیجی تو میرے وکیل مسرز سوئنہو بیبی لیزلی (SWINHOE BEEBY AND LESLIE) کو خط مورخہ ۱۱ مئی ۱۸۵۹ء کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ یہ مقدمہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش ہوا تھا، جہاں سے سپیشل کمشنر نے جو سزا دی تھی، اس کی توثیق کر دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس فیصلے کے خلاف جو دلائل میں پیش کرنا چاہتا تھا، ان پر غور کیے بغیر ہی آخری فیصلہ میرے خلاف کر دیا گیا۔ اس پر میں نے پھر درخواست ارسال کی، جس کا جواب مجھے، اکتوبر کے مکتوب میں ملا کہ یہ رد کی جاتی ہے۔

۵۔ کلکتہ کے معزز ترین مسلمانوں نے، جن کی وفاداری سے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں ہے، قاضی القضاۃ کی سرکردگی میں جو حکومت کا سب سے بڑا مسلمان افسر ہے، حکومت ہند سے اکتوبر (۱۸۵۹ء) میں درخواست کی کہ میری پیری اور ضعف جسمانی کے پیش نظر مجھے رہا کر دیا جائے۔ لیکن حکومت نے اس درخواست پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔

۶۔ ان حالات میں اب میرے پاس اس کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ آپ سے درخواست کروں کہ میرے خلاف نفس مقدمہ، اس کے فیصلے اور سزا سے ملکہ معظمہ کے اعلان معافی کی خلاف ورزی ہوئی ہے، جس کی رو سے قاتلوں اور بغاوت کے سرغنوں اور محرکوں کے علاوہ اور سب کو معافی کا دعدہ دیا گیا تھا۔ میری حیثیت ہی کیا ہے! میں نہ باغی ہوں، نہ باغیوں کا ساتھی۔ کمشنر نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔ اس لیے انصاف اور امن عامّہ کا تقاضہ

> یہ ہے کہ مجھے ملک سے باہر بھیج دیا جائے۔ بڑے بڑے سردار جو بغاوت کے سرغنے اور مشہور قاتل تھے، وہ تو رہا کر دیے گئے، بلکہ ان میں سے بعض کو پنشن بھی مل رہی ہے؛ لیکن برطانوی حکومت مجھ ناچیز بوڑھے سے ڈرتی ہے، جو کہ قبر کے کنارے پہنچ چکا ہے۔
>
> میری درخواست یہ ہے اور انصاف کا بھی یہی تقاضا ہے کہ مجھے رہا کر دیا جائے اور میری ضبط شدہ جاداد بحال کر دی جائے۔ ورنہ کم از کم رحم ہی کے طور پر یہ کیا جائے۔
>
> ۹ جنوری ۱۸۶۰ء

مقدمے کے کاغذات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وزیر ہند نے حکم دیا کہ یہ درخواست تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ ہندستان کے مقامی حکام کے پاس بھیج کر ان سے دریافت کیا جائے کہ مولانا کو رہا کر دینے کی صورت میں انھیں تو کوئی عذر نہیں ہو گا۔ مختلف دفتری مراحل طے کرتے ہوئے یہ کاغذات جب چیف کمشنر اودھ کے پاس پہنچے، تو اس نے ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء کو جواب دیا کہ اگر اس قیدی (مولانا فضل حق) کے ساتھ کسی طرح کی معمولی سی رعایت بھی کی گئی تو وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ چیف کمشنر کی اس رائے کے بعد ہندستان یا ولایت کے حکام بالا مولانا کی مندرجہ صدر درخواست پر کس طرح غور کر سکتے تھے! یاد رہے کہ چیف کمشنر صاحب کے اس آخری جواب کی تاریخ ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء ہے اور اس کے ہفتہ بھر بعد ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کا پورٹ بلیر میں انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ اب ذرا یہ عبارت پڑھیے:-[19]

> .... علامہ موجود نہ تھے کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آ رہے ہیں۔ وہ (سپرنٹنڈنٹ جیل انگریز) یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ (فضل حق) کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بےخبر میر منشی لفٹنٹ مغربی و شمالی

۱۹- باغی ہندستان؛ ۱۷۶-۱۷۷

صوبۂ اودھ سرگرمِ سعی تھے۔ یہ پروانۂ رہائی حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہوگئے۔ وہاں جہاز سے اُتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضلِ حق کا انتقال ہوگیا۔ اب سپردِ خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریک دفن ہوئے اور بے نیلِ مرام واپس لوٹے۔

قسمت کی بدنصیبی، کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! ہمیشہ کے لیے یہ آفتابِ علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہوگیا۔

اب تک مزار مرجعِ انام و زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ . . . .

اوپر جو واقعات بیان کر چکا ہوں، انھیں مدِ نظر رکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ ڈرامائی سین کہاں تک قابلِ اعتبار ہے!

یاد رہے کہ گورنر جنرل باجلاسِ کونسل یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان سے مشقت نہیں لی جائیگی، اور ان سے کسی طرح کا اہانت آمیز سلوک روا نہیں رکھا جائیگا۔ اس صورت میں یہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آنے کی بھی خوب رہی۔

پھر یہی نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مولوی شمس الحق صاحب ۲۰ اگست کو یعنی جس دن مولانا کا انتقال ہوا ہے، یا بفرضِ محال اگر تدفین اگلے دن ہوئی ہو، تو ۲۱ اگست کو سہی، انڈمان پہنچے تھے۔ انڈمان کے سفر میں جو مشکلات اس زمانے میں پیش آتی ہونگی، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لکھنؤ سے خشکی کے راستے کلکتے اور کلکتے سے بحری جہاز کے ذریعے انڈمان ـــــ مہینوں نہ سہی، آپ مہینا بھر سے کم کیا کہینگے گویا وہ ۲۰ جولائی کے لگ بھگ یہاں سے روانہ ہوئے اور لامحالہ "پروانۂ رہائی" اس سے پہلے صادر ہو گیا ہوگا۔ جب چیف کمشنر ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کی رہائی

کے خلاف اظہار رائے کر رہا ہے، تو کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ مولوی شمس الحق صاحب یہ پروانہ لے کر ۲۰ جولائی کو یہاں سے روانہ بھی ہو چکے تھے!

ایک اور بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر رہائی کا حکم صادر ہو ہی گیا تھا تو مولوی شمس الحق کو اسے دستی لے کر انڈیمان جانے کی کیا ضرورت تھی! اور کیا حکومت قیدیوں کی رہائی کے احکام ان کے رشتہ داروں اور متعلقین کے حوالے کر دیا کرتی ہے! پھر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں پورٹ بلیر نہیں بلکہ دہلی یا آگرہ یا لکھنؤ ہے، جہاں جنازے کے ساتھ "اژدھام" ہو سکتا ہے۔ انڈیمان کا جزیرہ عمر قیدیوں کے لیے اسی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ۱۸۵۸ء ہی میں مقرر ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں یعنی تقریباً ایک صدی بعد بھی یہاں کی ساری آبادی پچیس ہزار سے بھی کم تھی۔ اسی سے صرف اس کے صدر مقام پورٹ بلیر کی آج سے ایک صدی پہلے کی آبادی کا اندازہ کیجیے اور پھر یہ سوچیے کہ اس میں مسلمان کتنے ہوں گے اور پھر لفظ "اژدہام" پر غور کیجیے یا اقتباس کی آخری سطر ہے:

> اب تک مزار مرجع انام اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے

تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیسے لکھ گئے! یہ تاریخ و سیرت کی زبان نہیں۔

غرض اس سارے کی افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں۔

۸

آئیے، اب ان دعاوی پر نظر ڈالیں، جو مولانا فضل حق کے سیرت نگاروں نے ان سے منسوب کیے ہیں اور جنھیں ہم اس مضمون کے آغاز میں نقل کر چکے ہیں اور دیکھیں کہ یہ صداقت کی کسوٹی پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔

دعویٰ (۱): "مولانا فضل حق پر مقدمہ "سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت" کی بنا پر قائم ہوا"۔

آپ نے اوپر مقدمہ کی پوری رُوداد پڑھ لی اور فردِ جرم بھی دیکھ لی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس دعویٰ کی تینوں شقیں ٹھیک نہیں؛ بنائے مقدمہ ان تینوں میں سے کوئی

بھی نہیں تھی ۔ یا اکم از کم وہ واقعات نہیں تھے، جن کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا جاتا ہے ۔ اور یقیناً انھوں نے کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا تھا، جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو ۔

دعویٰ (۲): "جس جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تھا، وہ ان کا شاگرد تھا اور اسی لیے اسے ان سے ہمدردی تھی اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ بَری ہو جائیں"۔
یہ مقدمہ ابتدائی مرحلے پر کپتان تھر برن کے سامنے پیش ہوا اور اس کے بعد مسٹر جارج کیمبل سپیشل جوڈیشل کمشنر اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوا تھا ۔ ان تینوں میں سے کسی کے کسی زمانے میں بھی مولانا مرحوم کے ساتھ کام کرنے یا ان سے کام سیکھنے کا امکان نہیں ۔

دعویٰ (۳): "جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بَری کر دینے کے حق میں تھا"۔
اس مقدمے میں جیوری مقرر ہی نہیں ہوئی تھی ۔ دراصل یہ عدالت فوجی (مارشل لا) قسم کی تھی، ایسی عدالتوں میں جیوری نہیں ہوا کرتی ۔ اس لیے اس کے کسی رکن کے ان کی بریت کے حق میں ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

دعویٰ (۴): "مولانا فضلِ حق نے خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل" مثل تارِ عنکبوت عقلی اور قانونی ادلّہ" سے توڑ دیے تھے اور امید تھی کہ وہ بَری کر دیے جائینگے لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتویٰ کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہوا ہے، وہ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے، اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"!
مولانا کا وہ خط بھی آپنے دیکھا جو انھوں نے نواب رام پور کو لکھا تھا اور ان کا عدالت میں بیان بھی آپنے ملاحظہ فرمایا ۔ وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا، مجھے ایک میرے ہم نام میر فضل حق شاہجہانپوری کی جگہ دھوکے میں گرفتار کر لیا گیا ہے ۔ اس بات کا انھوں نے کئی مرتبہ اعادہ کیا ہے ۔ استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے وقت بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک اور فضل حق سرگرم باغی رہا ہے ۔

جہاں تک فتویٰ کا سوال ہے، اصلی فتویٰ مولانا عرشی نے اخبار الظفر دہلی سے لے کر اپنے مضمون میں نقل کر دیا ہے۔ اس کے آخر میں جن علماء کے دستخط ہیں، ان میں مولانا فضل حق کا نام ہی سرے سے نہیں۔ درحقیقت عدالت جس فتویٰ کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہ محض یہ ہے کہ ان کے قول کے مطابق جب عبدالحکیم کو تموخاں اور مولانا کے سامنے پیش کیا گیا ہے، تو مولانا نے قرآن کی آیت پڑھی[۲۰]، جس کا مفاد یہ تھا کہ جو شخص نصاریٰ کا دوست ہے، وہ گویا انھیں میں سے ہے، پس اس کا قتل جائز ہے۔ اگرچہ خود مولانا سرے سے اس واقعے سے ہی انکاری ہیں، لیکن اگر بفرضِ محال یہ درست بھی ہوتا جب بھی تو یہ وہ فتویٰ جہاد نہیں، جو ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں دیا گیا تھا اور جس کی طرف مولانا کے سیرت نگاروں نے اشارہ کیا ہے۔ پس یہ متہورانہ بیان، جو ان سے منسوب کیا جاتا ہے کہ "فتویٰ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا

۲۰۔ قصیدۂ ہمزیہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

میرا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھے ان نصاریٰ (یعنی انگریزوں) سے کسی قسم کی محبت اور دوستی نہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان سے دوستی قرآن کی نصِ محکم کی رُو سے کفر ہے کسی حق پرست انسان کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا اور ان (نصاریٰ) سے دوستی جائز بھی کیونکر ہو سکتی ہے! یہ ٹھہرے دشمن اس ذات پاک (یعنی رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم) کے جن کی خاطر یہ زمین و آسمان اور تمام کائنات پیدا کی گئی ہے" (باغی ہندوستان، ۴۴۸) یہاں ان کا اشارہ غالباً قرآن کی اس آیت کی طرف ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (المائدہ، ۵: ۵۱) (اے مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ یہ تمھاری مخالفت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ تم میں سے جو کوئی انھیں دوست اور مددگار بنائیگا تو وہ انھیں میں سے سمجھا جائیگا۔ اللہ ان لوگوں کو (کامیابی) کی راہ نہیں بتاتا جو ظلم کرنے والے ہیں۔

ہے، اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے" کس طرح درست اور حسبِ حقیقت ہو سکتا ہے؟

دعویٰ (۵) اس اقرار و اقبال کے بعد عدالت نے بعید رنج کے ساتھ "حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم دیا۔ عدالت کے رنج کا سوال ہی کہاں پیدا ہوا! استغاثہ نے جو الزام ان پر عاید کیے تھے، عدالت کے نزدیک وہ ثابت ہو گئے تھے۔ پس انھوں نے انھیں مجرم گردانا اور انھیں سزا دے دی۔ بلکہ جوڈیشنل کمشنر تو یہ سمجھتا ہے کہ انھیں سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور خاص طور پر انھیں جلاوطن کر دینا چاہیے۔ کیا اظہارِ رنج اسی طرح کیا جاتا ہے!

دعویٰ (۶): "یہ فیصلہ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا؟

اگر انھوں نے یہ فیصلہ "مسرت اور خندہ پیشانی" سے سنا تھا، تو اس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ (۱) جو الزام ان پر لگائے گئے تھے، ان کے نزدیک وہ صحیح تھے؛ اور (۲) وہ جانتے تھے کہ ان کا نتیجہ یہی سزا ہونا چاہیے تھی، جو مجھے دی گئی ہے؛ اور (۳) میں نے پہلے کارِ ثواب کیا تھا، اب اس سزا کے بعد درجۂ شہادت حاصل کر رہا ہوں۔ کیا ان میں سے کوئی صغریٰ و کبریٰ بھی درست ہے؟

وہ بار بار حکومت سے درخواست کرتے ہیں، خود بھی لکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی لکھواتے ہیں کہ میں بیگناہ اور مظلوم ہوں۔ دشمنوں اور چغل خوروں نے مجھے اس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ بلکہ اپنی پیرانہ سالی اور مصیبتوں کے ساتھ اپنی اولاد کی صغر سنی اور عسیر الحالی کا دردناک قصّہ بیان کر کے حکومت سے رحم کی التجا کرتے ہیں کہ مجھے رہا کر دیا جائے۔ خدا سے بھی گڑگڑا کے دعائیں کرتے ہیں کہ بارِ الٰہا! مجھے اس ابتلا سے نجات دلوا۔

اگر انھوں نے فیصلہ مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا ہوتا، تو کیا ان کا یہی رویہ ہوتا!

(۹)

غرض پورے حالات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم

نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو (اور اس کی طرف انھوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے)، لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے۔ نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے؛ انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا، نہ تلوار ہی اٹھائی۔

آج تک ان کی نسبت جو غلط باتیں مشہور ہو رہی ہیں، دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انھیں نہ صرف بزمِ علم و عقل اور مجلسِ قال اقول ہی میں صدر نشین، بلکہ "جنگ آزادی" میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر اتفاق سے بعض غیر محتاط بلکہ غلط روایات نے ہماری اس خواہش کی تکمیل کے لیے سامان بھی فراہم کر دیا اور ہم نے بے جھجک انھیں تسلیم کر لیا۔ اور اس پر کوئی ہمیں ملامت نہیں کر سکتا، کیونکہ پورے واقعات تک ہماری رسائی ہی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب کہ حقیقت واشگاف ہو کر ہمارے سامنے جلوہ افروز ہو گئی ہے، ہمیں اپنی گزشتہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔ بےشک، اتنی لمبی مدت کے معتقدات کو ترک کرنا آسان نہیں اور خوش اعتقادی ہمیں اس سے بغاوت پر ابھارے گی، لیکن مرحوم کی صحیح عزت اسی میں ہے کہ ہم انھیں ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں، نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کر کے ان کا ایک فرضی بت بنائے رکھیں، جو ممکن ہے، خوبصورت تو ہو، لیکن اصل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن سوچیے تو کہ آخر ہمیں اس پر کسی طرح کا رنج اور افسوس کیوں ہو؟ ان کی علمی اور ادبی اور دماغی صلاحیتوں کے باعث ان کا جو مقام ہماری نظروں میں ہے، وہ تو بہرحال اپنی جگہ پر قائم ہے۔ انھوں نے علم و فضل کی جو شمع روشن کی تھی، وہ بحمدہٖ اب بھی پوری تابناکی سے ہماری علمی مجلسوں میں اجالا کر رہی ہے اور ان کا یہ صدقۂ جاریہ خدا چاہے تو رہتی دنیا تک ہمارے دل و دماغ کے لیے سامانِ تسکین مہیا کرتا رہیگا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

استدراک

میں نے مضمون کے شروع میں مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم کے اس مضمون کا ذکر کیا

ہے، جس میں انھوں نے علّامہ فضل حق خیرآبادی کا وہ خط نقل کیا ہے، جو مولانا خیرآبادی نے نواب فردوس مکان یوسف علی خان والیِ رامپور کے نام لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے دورانِ غدر کسی ہنگامے میں اپنی عدم شمولیت کے ادّعا کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ دراصل مجھے سیّد فضل حق شاہجہانپوری کے دھوکے میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ چونکہ عرشی مرحوم کا یہ مضمون اب نایاب ہے، اس لیے میں یہاں یہ خط نقل کر رہا ہوں، تاکہ یہ داستان مکمل ہو جائے:

جناب عالی جناب نواب صاحب خداوندِ نعمت، فیاضِ زماں، ملاف و معاذِ علماے دوراں دام اقبالہٗ

بعتز عرض می رساند کہ پیش ازیں دو تا عریضۂ عقیدت مشتمل بر ابتلاے خویش ارسالِ عالی جناب کردہ ام۔ بنظرِ اشرف گذشتہ کاشفِ فحاوی مندرجہ شدہ باشد۔ دریں روبکاری ایں جا واضح شد کہ فدوی را بعلّتِ نوکریِ خان بہادر خان و نظامتِ بیلی بھیت و چکلہ داریِ محمدی و افسریِ لشکرِ باغی ماخوذ کردہ اند، حال آنکہ فدوی ازیں ہر سہ امر محض بری است، و منشاءِ مواخذہ آنست کہ شخصے سیّد فضل حق نام از ساداتِ شاہجہانپور کہ قبل ازیں در سرکارِ ابد قرارِ بندگانِ عالی ملازم ماندہ بسر رشتہ داریِ بیلی بھیت مامور شدہ، و زمانے تحصیلدارِ آنولہ و بیلی بھیت ماندہ بود، و در ابتداے غدر از طرفِ خان بہادر خان ناظمِ بیلی بھیت گردید و بعدِ فتحِ بریلی در ملکِ اودھ رسیدہ از طرفِ خان علی خان چکلہ دارِ محمدی شدہ۔ پس از زمانے بافسریِ کدامی لشکرِ باغی ہمراہِ فیروز شاہ آں طرفِ جمن فرار کرد۔ عزیزانِ او در سرکارِ کمپنی بعہدہاے جلیلہ مامور اند۔ چنانچہ برادرِ حقیقیِ او مولوی مبین ڈپٹی کلکٹر سہارنپور بود۔

مہتمانِ اخبار خانہ خراب ناواقف ازیں تفصیل کہ او شخصے دیگر است و فدوی از شیوخ خیرآباد شخصے دیگر، در اخبار نامہا حالِ نظامتِ بیلی بھیت و محمدی و

افسریِ لشکرو فرارِ او بافیروز شاہ آں طرفِ جمن نوشتہ بعض علامات فدوی افزودند کہ برادرِ حقیقیِ او در سرکارِ مہاراجہ پٹیالہ نوکر و برادرِ دیگرش در سہارنپور ڈپٹی کلکٹر است، و حاکمانِ ایں جا بہ اشتباہِ ہماں مولوی فضل حق کہ ہمنام و در بعضے علامات شریکِ فدوی است، فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند۔

لہٰذا عرض رسانِست کہ اسمٰعیل خان رئیسِ بالاگڑھ دریں روز ہا وارد آں دیار اند، و از حالِ فدوی و مولوی فضل حق شاہجہانپوری مذکور بخوبی واقف۔ بالیشاں ایما رود، تا ایشاں کیفیتِ تفصیلی مشارٌ الیہ و حالِ عبورِ او دریائے جمن را ہمراہ فیروز شاہ و حالِ بے جرمی فدوی نوشتہ مع عرضیِ خود بنام ترب صاحب کمان افسرِ بریلی متضمن درخواستِ ارسالِ کیفیت مذکور بذریعہ چٹھی خود بحکمۂ اسپشل کمشنر لکھنؤ خدمت ترب صاحب موصوف روانہ دارند[۱] و در کیفیتِ تغائرِ بسیار میانِ فدوی و فضل حق شاہجہانپوری ثابت سازند، و نوکر بودنِ فدوی بسرکارِ کدامی باغی و افسر بودنِ فدوی بکدامی لشکر و ناظم نماندنِ فدوی بعلاقۂ ریلی بھیت و محمدی، ایں جملہ امور واقعی است، بوجہ احسن ثبت کنند، تا صاحب موصوف عرضی و کیفیتِ مرسلۂ ایشاں را بہمراہ چٹھی خود دریں جا روانہ فرمایند و بواسطۂ آں چٹھی و کیفیت اشتباہ حکامِ ایں جا رفع شود و نمک خوارِ قدیم رہائی یافتہ بدعاے ترقی و جاہ [مشغول] گردد۔ از پرورشِ خاوندانہ و مواساتِ کریمانہ امیدوار است توجہ بسیار بحالِ زارم مبذول شود و بعجلت ہر چہ تمامتر اثرِ اجابتِ مسئول ظاہر گردد۔ واجب بود، عرض نمود

آفتابِ ترقی جاہ و جلال ہموارہ تاباں باد

ترقی خواہ
عرضی مہر (فضل حق ۱۲۲۴)
نمک خوارِ قدیم
۱۸ فروری

---

[۱] یہاں عبارت کچھ گنجلک ہے۔

اس خط سے ظاہر ہوا کہ علامہ فضل حق خیرآبادی مرحوم کا یہ دعویٰ تھا کہ

(۱) میں کبھی خان بہادر خان کی (جسے وہ باغی سمجھتے تھے) ملازمت میں نہیں رہا؛

(۲) میں کسی زمانے میں بیلی بھیت کا ناظم یا محمدی کا چکلہ دار نہیں تھا؛

(۳) میں نے کبھی کسی باغی لشکر کی کمان نہیں کی۔

(۴) یہ سب کوائف ایک شخص سید فضل حق شاہجہانپوری سے متعلق ہیں، اور مجھے ان صاحب کے دھوکے میں ماخوذ کر لیا گیا ہے۔

لہٰذا وہ نواب فردوس مکان سے درخواست کرتے ہیں کہ رئیسِ مالاگڈھ اسمٰعیل خان کو (جو دونوں کو خوب جانتے ہیں) ہدایت کی جائے کہ موصوف یہ تمام کوائف، اور سید فضل حق شاہجہانپوری اور فضل حق خیرآبادی — دونوں کے تفاوت اور جُدا جُدا شخصیتیں ہونے کا ثبوت، اپنے سفارشی خط کے ساتھ، لکھ کر اسپیشل کمشنر، لکھنؤ کے پاس بھیج دیں، تاکہ انھیں اس مقدمے سے رہائی مل سکے۔

یہی باتیں انھوں نے فوجی عدالت کے سامنے بھی کہی تھیں جیسا کہ مضمون مندرجۂ صدر میں بیان ہوا۔

سید فضل حق شاہجہانپوری کے مختصر حالات "تذکرۂ کاملانِ رامپور" از حافظ احمد علی خان شوق (ص ص ۳۲۰ - ۳۲۱) میں، اور "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات)" از محمد ایوب قادری (ص ص ۵۶۶ - ۵۶۸) مطبوعہ کراچی (جون ۱۹۷۶ء) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ذوق کا مذہب

اردو کے تذکرہ نگار بالعموم صاحب ترجمہ کے مذہب سے متعلق کوئی تصریح نہیں کرتے۔ اس لیے جب میں نے مولوی کریم الدین کے تذکرے "طبقات الشعرائے ہند" (ص ۴۵۸) میں پڑھا کہ "مذہب (ذوق) ان کا شیعہ سننے میں آیا ہے"، تو مجھے تعجب ہوا، کیونکہ بظاہر یہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

مجھے شبہہ ہوا کہ یہ اطلاع درست نہیں، بلکہ انھوں نے یہ بات نیک نیتی سے نہیں لکھی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے میں نے آب حیات سے استفادہ کیا کیونکہ آزاد مرحوم سے زیادہ شیخ کا کوئی ارادتمند نہ تھا۔ اور آب حیات میں جس شرح و بسط سے انھوں نے اپنے استاد کے حالات تحریر فرمائے ہیں، اس سے بعض حلقوں میں تو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کی علت غائی ہی شیخ کی ذات اور ان کی شاعری کو اُجاگر کرنا ہے۔ مگر میں نے آب حیات کی ورق گردانی کی، تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہاں یہ سطریں دیکھیں:

> فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ انھیں ایسا اعتقاد تھا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے

اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہیں کرتے تھے۔ اس واسطے ان کے مذہب کا حال
کسی کو نہیں کھلا (صفحہ ۴۶۶)

مانا کہ ان کی صلح کل طبیعت کی وجہ سے "ان کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھُلا" مگر کیا یہ حال حضرت آزاد پر بھی نہ کھلا کہ ان کا کیا مذہب ہے! ان کا فرض تھا کہ اس باب میں اپنے علم کے مطابق لوگوں تک صحیح واقفیت پہنچا دیتے اور تذکرہ نگاری کا حق ادا فرماتے۔ بعینہٖ یہی الفاظ انھوں نے اپنے مرتبہ دیوانِ ذوق کے دیباچے میں بھی لکھے ہیں (ص ۲۶) اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں دیوانِ ذوق کو دیکھ کر فیصلہ کرتا، اگرچہ یہ طریقہ نہایت غیر یقینی اور شبہات سے پُر ہے۔ مگر چونکہ اس کے علاوہ کوئی اور ماخذ نہ تھا (یا کم از کم مجھے اس کا علم نہیں) اس لیے مجبوری تھی۔ دیوان کھولتے ہی پہلی غزل میں یہ اشعار نظر آئے:

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا — الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا
رہے نامِ محمدؐ لب پہ یارب! اول و آخر — الٹ جائے بوقتِ نزع جب سینہ میں دم میرا
محبت اہلِ بیتِ مصطفیٰؐ کی نور برحق ہے — کہ روشن ہو گیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا
دکھائی مجھ کو راہِ شرع، اصحابِ پیمبرؐ نے — چراغِ راہ ہے اکرامِ اصحابِ کرم میرا
کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا — کہ ہے دُرِّ نجف ہو کر چمکتا دُرِّ یتیم میرا
رہیگا دانہ افشاں مزرعِ امید بخشش ہیں — غمِ آلِ نبیؐ سے دانہ، ہر اشکِ نم میرا

شہِ بغداد کا خطِ غلامی، ذوق رکھتا ہوں
نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جامِ جم میرا

اس ایک غزل میں جنابِ شیخ نے حمد و نعت کے دو شعروں کے علاوہ اہل بیت اور حضرت علیؓ اور صحابہ کرام کی شان میں چار اشعار کہے ہیں مقطع میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا ذکر ہے۔ اس سے مولانا آزاد کے مندرجہ صدر کلام کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ ان کو جملہ بزرگانِ دین سے اعتقاد تھا اور وہ علماء سلف کا بہت ادب کرتے تھے۔ اہل بیت اور خصوصاً شہیدِ کربلا سے متعلق انھوں نے بعض اور جگہ بھی لکھا ہے۔ اور

ان کی محبت کو ذریعۂ سعادت قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

محبِ حسین ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حرؑ
تھا گرچہ اشقیا میں شہیدوں میں مل گیا

ایک رُباعی میں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین دونوں کا ذکر دیکھیے، کس دلنشیں انداز سے کرتے ہیں:

سبطینِ نبی یعنی حسن اور حسین — زہرا اور علی کے دونوں وہ نورالعین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لیے — اے ذوق لگا آنکھوں سے ان کے نعلین

ایک قصیدہ جو جناب سید عاشق نہال صاحب کی مدح میں تحریر فرمایا ہے، اپنے متعلق اس دعا پر ختم کرتے ہیں۔

نکلے بہ صبحِ حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمدؐ کی آل کے

ان سب اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں حضرت علی اور ان کے اولوالعزم صاحبزادوں سے خاص وابستگی تھی اور ان کا رجحان بداہتہً تفضیلیت کی طرف تھا، مگر جیسا کہ ان کے مرثیے کی غزل سے عیاں ہے۔ انھیں دوسرے صحابۂ کرام سے کوئی عناد نہ تھا بلکہ وہ انھیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور رہنمایانِ اسلام سمجھتے تھے، ان کا مذہب وہی تھا جو عام اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ وہ سب صحابۂ رسول کو ذکرِ خیر سے یاد کرتے ہیں۔ مگر ان میں صرف اتنا اضافہ تھا کہ وہ تفضیلی تھے، حضرت علیؓ سے انھیں خاص محبت نظر آتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے کسی زمانے میں نظامِ دکن عثمان علی خان نے اپنے ایک اعلان میں اپنے مذہب سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حنفی سُنّی ہوں، البتہ تفضیلیت سے ممتاز ہوں۔ حضرت ذوق بھی ایک رُباعی میں حضرت علیؓ سے متعلق لکھتے ہیں:

اعلیٰ ہے علی کی امامت کا مقام — رکھتے ہیں خبر اس سے یہاں خاصِ علم
جو لوگ صفِ اولِ میثاق میں تھے — پوچھے کوئی ان سے کہ وہ کیسا تھا امام

اس کے باوجود وہ پہلے تینوں خلفاءِ اسلام کے حامیِ شریعت اور عابد و مرتاض ہونے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

رہے تا کام دینداروں کو احکامِ شریعت سے — خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبہ کی زیارت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محرابِ عبادت سے — نمازِ اہلِ سنّت تا ہو مسجد میں جماعت سے
ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیرِ منبر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر عثمان و حیدر ہو

اس سے ظاہر ہے کہ شیخ مرحوم کا عقیدہ دوسرے سُنّی حضرات سے الگ نہیں؛ انھیں خلفاے اربعہ میں سے ہر ایک سے محبت تھی، وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے اور ان کی خدماتِ دینیہ کی تعریف کرتے تھے۔ ہاں، انھیں حضرت علیؓ سے ان کے حضرت زہرا بتول کے شوہر اور حسنین کے والد بزرگوار ہونے کی وجہ سے خاص محبت تھی۔ مگر اس میں اتنا غلو نہ تھا کہ وہ دوسرے صحابہ کو غاصب قرار دینے لگیں یا اُن پر تبرہ بازی شروع کردیں۔ وہ حبِّ علی کو نور سے موسوم کرتے ہیں، مگر تبرہ کو اس نور میں ظلمت کی آمیزش سے کم نہیں سمجھتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

تم بیٹھے بغل میں ہو رقیبِ دغلی کی — کی گرم بغل ہم نے بھی گورِ بغلی کی
اے ذوق! نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت — کیا کام تبرہ کو محبت میں علی کی

الغرض میں نے دیوانِ ذوق کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت ذوق شیعہ نہ تھے۔ جن لوگوں کو شک گزرا ہے کہ ذوق شیعہ تھے، مگر بہادر شاہ کے سنّی ہونے کے سبب سے وہ کھل کر اپنی شیعیت کا اظہار نہیں کرسکتے تھے اس لیے انھوں نے تقیہ کیا، میرے خیال میں ان اصحاب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کی تائید میں ایک اور امر بھی پیش کیا جاسکتا ہے:

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے تعلقات شیخ مرحوم سے نہایت گہرے تھے اور آزاد ان کے ایسے شاگردِ رشید پیدا ہوئے، کہ اگر وہ نہ ہوتے تو غالباً آج کوئی ذوق کا نام نہ جانتا۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ اس خاندان سے ان کے معتقدات پوشیدہ رہے ہوں۔ اس لیے

اگر اس پر بھی آزاد نے اپنے اُستاد کے حالات میں اس موضوع کو تشنہ چھوڑ دیا، تو اس کا کوئی سبب ہونا چاہیے۔ دیوانِ ذوق کی ترتیب یا آبِ حیات کی تالیف کے وقت انھیں بہادر شاہ کی سیاست کا خوف نہ تھا کہ وہ تقیہ پر مجبور ہوتے۔ پس اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ ان کے اُستاد کا عقیدہ ان کے اپنے عقیدے سے مختلف تھا، جس کا اظہار انھیں ناپسند تھا۔ خاندانِ آزاد کی شیعیت سے کسی کو انکار نہیں، اگر ذوق بھی شیعہ ہوتے، تو یہ آزاد کے لیے مقامِ فخر تھا کہ انھیں بھی اپنا ہم نوا ظاہر کرتے۔ بہر حال اس باب میں ان کی خاموشی اور ابہام معنی خیز ضرور ہے۔

استدراک

یہ مضمون لکھنے کے ایک مدت بعد جب میں دلّی آیا، تو مجھے مولوی کریم الدین کے تذکرہ کا وہ نسخہ مل گیا، جو کسی زمانے میں ناصر نذیر فراق دہلوی کی ملکیت رہ چکا تھا (یہ نسخہ اب میرے پاس ہے) اس میں ذوق کے مذہب سے متعلق مندرجہ صدر عبارت پر نشان دے کر فراق نے حاشیے میں یہ عبارت لکھی ہے:

> غلط لکھ دیا ہے کہ مذہب ذوق کا شیعہ تھا۔ وہ سنّی المذہب تھے۔ انھوں نے مدحِ غوث پاک لکھی ہے اور اس (کے) علاوہ بہر طور ثابت ہے کہ اوستاد ذوق سنّی حنفی تھے۔ فراق

غالباً اس پر کسی مزید حاشیے کی ضرورت نہیں ہے۔

انشا کی تاریخِ ولادت ووفات

پچھلے دنوں مجتبیٰ فرخ جلالی ایم اے (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے مجھے ایک مجلّد دکھایا جس میں متعدد خطی نسخے محفوظ ہیں۔ یعنی

(۱) قواعدِ فارسی از روشن علی انصاری جونپوری۔ یہ کتاب روشن علی جونپوری نے اپنے بیٹے فضل علی "و دیگر فرزندان دلبندان طال عمرہ" کے لیے تصنیف کی تھی۔ اس کا ترقیمہ ہے: "تمام شد نسخۂ قواعدِ فارسی بتاریخِ دوم شہر شوال ۱۱۸۳ھ بخطِ احقر العباد فیض اللہ انصاری۔"

(۲) منتخب رسالۂ قافیہ میر عطاء اللہ (اس کے اخیر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے)

(۳) منتخب رسالہ عروضِ سیفی۔ اس کے آخر میں رسالۂ منظوم از ملا امین خطیب جونپور" دربیان زحافاتِ رباعی" لکھا ہے۔ اس میں دو اشعار تمہید کے بعد آٹھ شعر مثنوی کے ہیں اور پھر تین قطعے (کوئی ترقیمہ موجود نہیں ہے)

(۴) رسالۂ معمّا۔ اس کے آخر میں صرف اتنا ترقیمہ ہے: باتمام رسید سنہ ۱۱۸۳ ہجری۔

(۵) رسالۂ صغیر در فنِ معمّا تصنیف مولوی جامی رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۸۳ھ

یہ تمام نسخے ایک ہی خط میں اور بظاہر سب کے سب ۱۱۸۳ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن پہلے رسالے یعنی قواعدِ فارسی کے سوائے کسی جگہ مکمل ترقیمہ نہیں ملتا۔ پہلے رسالے کا کاتب فیض اللہ انصاری معلوم ہے۔ چونکہ تمام رسائل کا سوادِ خط ایک سا ہے، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ باقی رسالے بھی اسی کے قلم سے ہیں۔

جہاں یہ سب رسالے ختم ہوتے ہیں، اس کے بعد کے خالی صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے۔

تاریخ تولدِ سید انشا اللہ خان
در ماہ صفر المصفر سنہ ۱۱۶۶ ہجری نبوی مطابق سنہ ۱۱۶۵ بنگلہ
مطابق سنہ ۵ جلوس احمد شاہ بادشاہ شب یکشنبہ
یعنی صبح آں شب یکشنبہ روزِ شنبہ، پنجگھڑی
شب باقی ماندہ تولد شدن
و سالِ وفات در سیم شہر جماد الثانی روزِ دوشنبہ سنہ ۱۲۳۲ ہجری نبوی
شصت و شش سال عمر کلیہ۔
سال
سید عبدالمسیح ۔ (؟) ۔ سید انشاء اللہ خان

پھر سیدھے ہاتھ کے نچلے کونے میں کسی اور ہاتھ سے یہ یادداشت درج ہے:

لبست و دوم ذیقعد یوم پنجشنبہ
اچھی بیگم صاحبہ رحلت کرد
سنہ ۱۲۳۲

پورے صفحے کا عکس شاملِ مضمون ہے اس لیے قاری حضرات اسے دیکھ سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایک لفظ پڑھا نہیں جاسکا۔ پہلی عبارت کے کاتب کا نام سید عبدالمسیح ہے۔ اور بظاہر وہ سید انشاء اللہ خان کا کوئی عزیز قریب ہے۔ بگمانِ غالب اس نے یہی رشتہ لکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن بعد کو اسے معلوم ہوا کہ اپنا رشتہ ظاہر کرنے کو اس نے جو لفظ لکھا ہے، وہ ٹھیک نہیں۔ اس پر اس نے اسے قلمزد کرکے اس کی جگہ سطر سے نیچے کی طرف دوسرا لفظ لکھ دیا۔ یہی لفظ پڑھا نہیں گیا۔

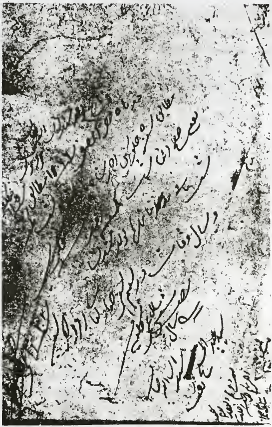

کاتب کچھ زیادہ تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا؛ پوری عبارت اس پر دال ہے۔ انشا کے ایک علاتی بھائی مسیح اللہ خاں تھے یعنی جب انشا کے والد ماشاء اللہ خاں مصدر دلی سے مرشد آباد گئے ہیں تو انھوں نے وہاں دو نکاح کیے تھے۔ پہلی بیوی عجیب النسا بیگم بنت نواب بنگالہ تھیں۔ ان کے بطن سے مسیح اللہ خاں پیدا ہوئے؛ مہابت جنگ ان کا خطاب تھا۔ وہ شاعر بھی تھے۔ اظہر تخلص تھا۔ دوسری بیوی کے بطن سے انشا اللہ خاں تھے۔ اس عبارت کے کاتب عبد المسیح بظاہر انشا کے علاتی بھائی مسیح اللہ خاں کے علاوہ کوئی اور شخص ہیں، اگرچہ اس کا بھی خفیف سا امکان ہے کہ مسیح اللہ خاں ہی کا گھر کا نام عبد المسیح رہا ہو، اور یہاں انھوں نے اسی لقب سے دستخط کیے ہوں۔

بہرحال جس طریقے پر مندرجۂ صدر عبارت لکھی گئی ہے، بالخصوص تاریخ وفات کی تعیین کہ دن اور مہینا تک درج ہے، اس سے قیاس کرنا غلط نہیں ہو گا کہ یہ ان کے کسی قریبی رشتے دار کی لکھی ہوئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ خود انشا کے گھر ہی میں سے کسی فرد نے لکھی ہو اور یہ قلمی کتاب بھی ان کے گھر کی ہو۔ اس صورت میں اس مخطوطے کا کبھی نہ کبھی خود انشا کی تحویل میں رہنے کا امکان بھی ہے۔

میرا گمان ہے کہ نچلے کونے میں جس خاتون اچھی بیگم کی وفات کی یادداشت ہے، یا انشا کی بیوی ہیں، جن کا اس تاریخ کی رو سے انشا کی وفات کے سال بھر بعد ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۳۳ھ کو انتقال ہوا۔ چونکہ خطی نسخے کے آخر میں انشا کی تاریخہاے ولادت و وفات کا اندراج ہو چکا تھا، جب اچھی بیگم کا انتقال ہوا، تو کتاب کا کل کر ان کی تاریخ وفات بھی وہیں درج کر دی گئی، تاکہ یہ داستان مکمل ہو جائے۔ اتنی تنگ جگہ میں خاص اسی نسخے کے آخر میں، ان کے انتقال کی یادداشت درج کرنے کی اور کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟

انشا کی ولادت کی تاریخ آج تک معلوم نہیں تھی۔ قیاس آرائیاں کرنے کے لیے البتہ کچھ حوالے موجود تھے۔ ان میں سب سے اہم میر قدرت اللہ قاسم کا بیان ہے۔

۱۔ قاضی عبد الودود: میر ماشاء اللہ خاں مصدر (۱) (معاصر (۲)، ۳۵)

لکھتے ہیں:[2]

انشا تخلص حکیم انشاء اللہ خان فرزند ارجمندِ حکیم ماشاء اللہ خان مرحوم
است، سلمہٗ ربہٗ۔ ۔ ۔ ۔ در عہدِ دولتِ امیر الامرا نواب ذوالفقار الدولہ
بہادر۔ ۔ ۔ میر ماشاء اللہ خان ۔ ۔ ۔ ۔ از ممالکِ شرقیہ واردِ حضرتِ
دہلی شدہ۔ خیلے مردِ جوانمرد و جواد و با مروۃ و فتوۃ بود۔ گویند در
ایامِ حکومتِ سراج الدولہ وغیرہ حکامِ بنگالہ ہیزدہ زنجیر فیل بہ فیلخانۂ
میر شار الیہ بود۔ تولدِ میر انشاء اللہ خان سلمہ الرحمٰن در ہمان آوان
بمرشد آباد اتفاق افتادہ۔

اس سے یہ خیال کیا گیا[3] ہے کہ انشا کی ولادت عہدِ سراج الدولہ میں ہوئی۔ میرے نزدیک "در ہماں آوان" سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ قاسم اوپر میر ماشاء اللہ خان کے حالات بیان کر رہا تھا اور اس نے آخر میں ضمناً "ان کے" سراج الدولہ وغیرہ حکامِ بنگالہ" کے زمانے میں تموّل کا ذکر بھی کر دیا۔ "در ہماں آواں" سے قاسم کی مراد صرف اتنی ہے کہ مصدر کے ممالکِ شرقیہ (جن میں مرشد آباد بھی شامل ہے) کے قیام کے زمانے میں انشا پیدا ہوئے۔ بہر حال ہمیں معلوم ہے کہ سراج الدولہ رجب ۱۱۶۹ھ تا شوال ۱۱۷۰ھ (اپریل ۱۷۵۶ تا جون ۱۷۵۷ء) حکمراں رہے۔ اس تحریر سے معلوم ہوا کہ انشا ان کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے، بلکہ ان کے گدی پر بیٹھنے سے تین سال پہلے صفر ۱۱۶۶ھ (دسمبر ۱۷۵۲ء) میں پیدا ہوئے تھے۔

اس ایک تاریخ کے متعیّن ہو جاتے سے کئی اور مصنفوں کے بیانات، جو سراج الدولہ کے عہدِ سلطنت کی ولادت تسلیم کرنے سے شتبہ تھے، زیادہ قرینِ قیاس نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً مردان علی خان مبتلا لکھتے ہیں،

۲۔ قاسم: مجموعۂ نغز (۱): ۸

۳۔ مثلاً اسلم پرویز: انشاء اللہ خان انشا: ۲۱

۴۔ مردان علی خان: گلشنِ سخن: ۴۳ (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی)

راقمِ حروف وَے (انشا) را در صغرِ سن در ہنگامِ دولتِ میر جعفر خان دیدہ بود

یہ میر جعفر وہی شخص ہے، جو کلائیو سے مل گیا تھا اور جو پلاسی کے میدانِ جنگ میں سراج الدولہ کی شکست کا باعث ہوا تھا۔ سراج الدولہ کی اس جنگ میں ہلاکت کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو بنگالے کا نواب بنا دیا۔ یہ اواخر جون ۱۷۵۷ء کا واقعہ ہے لیکن انگریزوں سے اس کی بھی نہ نبھ سکی، اور انھوں نے اسے ۱۷۶۰ء میں معزول کر دیا۔ اب سلطنت کی باگ ڈور میر قاسم کے ہاتھ آئی۔ اگر ۱۱۶۹ھ کی ولادت تسلیم کی جائے، تو میر جعفر کے زمانے میں انشا کی عمر بمشکل ڈیڑھ دو برس کی ٹھہرےگی اور یہ قرینِ قیاس نہیں ہے کہ کوئی اس عمر کے بچّے کے دیکھنے کو موضوعِ گفتگو بنائے؛ یہ صغر سنی نہیں، بلکہ شیر خوارگی کا زمانہ ہے۔ لیکن ۱۱۶۶ھ (۵۲-۱۷۵۳ء) کی ولادت کی رُو سے میر جعفر کے زمانے میں انشا کی عمر پانچ سے نو برس تک کی ہوگی؛ اور یہ واقعی صغر سنی کا زمانہ ہے۔

میر علاء الدولہ اشرف علی خان لکھتے ہیں[۵]: "پسرِ ایشان یعنی ماشاءاللہ خاں مصدر، جوانِ وجیہہ، بدل نزدیکتر است"۔ میر علاء الدولہ کا تذکرہ ۱۱۷۸ھ (۶۵-۱۷۶۴ء) کی تالیف ہے[۶]۔ اگر ۱۱۶۹ھ کی تاریخِ ولادت درست ہوتی، تو ماننا پڑتا ہے کہ مصنف نو سالہ لڑکے کو "جوانِ وجیہہ" کہہ رہے ہیں۔ لیکن واقع یہ ہے کہ اس وقت ان کی عمر بارہ برس کی تھی؛ ہم کسی صحت ور اور توانا جسم کے بارہ سالہ لڑکے کو (جیسا کہ انشا تھے) "جوانِ وجیہہ" کہہ سکتے ہیں۔

اسی طرح احمد علی سندیلوی کا بیان ہے: "چوں بشانزدہ سال رسید، بحضورِ نواب وزیر الممالک[۷]

۵۔ علاء الدولہ: تذکرۃ الشعرا (قلمی): ۳۶۲ (الف) بحوالۂ دستور الفصاحت: ۱۴۳ (مرتبہ امتیاز علی عرشی)

۶۔ احمد علی یکتا: دستور الفصاحت: ۶۳ (دیباچۂ مرتبہ امتیاز علی عرشی)

۷۔ احمد علی: مخزن الغرائب (قلمی): ۷۰ (ب) بحوالۂ دستور الفصاحت: ۱۰۵) یہی بات مرزا محمد علی کاتب نے بھی لکھی ہے [تذکرہ کاتب (قلمی): ۵۰ (ب)]

شجاع الدولہ داخلِ جلسا شد "، شجاع الدّولہ کا زمانہ ۱۱۶۶ھ تا ۱۱۸۸ھ (۱۷۵۳ء-۱۷۷۵ء) ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انشا ۱۱۸۲ھ (۱۷۶۸ء) میں شجاع الدّولہ کے دربار میں پہنچے اور ان کی وفات تک یعنی تقریباً چھ سال ان سے وابستہ رہے۔

انشا کی تاریخِ وفات سے متعلق ہم بالکل تاریکی میں تو نہیں تھے، لیکن آج تک مذبذب ضرور رہے ہیں۔ ان کی وفات کی دو تاریخیں ان کے ہمعصروں نے کہی ہیں۔ ایک، ان کے شاگرد بسنت سنگھ نشاط نے کہی اور دوسری مصحفی نے۔ نشاط کی تاریخ ہے:

خبرِ انتقالِ میر انشاء — دل بغم دیدۂ نشاط شنفت
سالِ تاریخ او زجانِ اجل — "عرفیِ وقت بود انشاء" گفت

(۱۲۳۰ + ۳ = ۱۲۳۳)

اس کے برعکس مصحفی کی تاریخ سے ۱۲۳۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

انشاء اللہ خان کہ بود از فصحا — زیں دار چوں رفت جانبِ ملکِ بقا
تاریخش گفت مصحفیِ بے کم و کاست — "اے وائے کہ مردہ قدردانِ شعرا"

(۱۲۳۲)

چونکہ نشاط خود انشا کے شاگرد تھے، اور انھوں نے تعمیہ سے تاریخ نکالی ہے، جو اہتمام اور سعی کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے بعض لوگ اسے صحیح مان کر ۱۲۳۳ھ کی تاریخِ وفات کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ درست نہیں، بلکہ صحیح وہی ہے جو مصحفی نے لکھی تھی۔

غرض اب یہ بات طے شدہ تسلیم کی جا سکتی ہے کہ انشا مرشد آباد میں صفر ۱۱۶۶ھ مطابق دسمبر ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوئے، اور ان کا انتقال لکھنؤ میں بروز دوشنبہ ۳۰ جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ کو ہوا۔ میرے سامنے جو جنتری ہے، اس میں جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ کے صرف ۲۹ دن دیے ہیں، اور ۲۹ جمادی الثانی کو جمعہ ۱۶ مئی ۱۸۱۷ء تھا۔ لیکن یہ ہمعصر شہادت زیادہ قوی ہے اور ایک اور دلیل ہے، ان جنتریوں کی غلطی پر۔ اگر حساب کیا جائے تو شاید ۳۰ جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ کے سامنے ۱۹ مئی ۱۸۱۷ء پڑے گا۔

استدراک

یہ مختصر مضمون ماہی "تحریر" کے شمارۂ اپریل/جون ۱۹۷۳ء میں چھپا تھا۔ بہت دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ جناب پروفیسر شیام لال کالڑا (عابد پیشاوری) نے اس کے جواب میں کوئی مضمون لکھا ہے۔ چونکہ ان کا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا تھا میں نے ان سے اس کی نقل مہیا کرنے کی فرمایش کی۔ انھوں نے میری درخواست قبول کر کے اسے نقل کر کے بھیج دیا۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اتنی طویل تحریر کو ہاتھ سے نقل کرنے کی زحمت گوارا کی۔ ذیل میں ان کے مضمون کے مختلف نکات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں:

(۱) لکھتے ہیں:

> انھوں نے (یعنی مصحفی نے) انشا کی تاریخ پر۔۔۔ اس لیے تاریخ کہی کہ نشاط کی تاریخ تعمیہ سے ہے:
>
> سالِ تاریخ او زجانِ اجیل "عرفیِ وقت بود انشا" گفت
>
> (۱۲۳۳ = ۱۲۳۰ + ۳)
>
> نشاط کی تاریخ اس لیے قابل ترجیح ہے کہ اس میں کسی الجھن، غلطی یا غلط فہمی کا امکان کم ہے۔ اس کے برعکس مصرعِ مصحفی نزاعی ہے کیونکہ شعراء کے آخر کا ہمزہ اکثر لکھنے میں چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے ایک عدد کا التباس پیدا ہوتا ہے۔ "بحرالفصاحت" میں لکھا ہے: "ہمزہ کا۔۔۔ بعض ایک عدد اور بعض بہ صورت "یا" لکھ کر دس عدد شمار کرتے ہیں؛ اور بعض مہمل چھوڑ دیتے ہیں۔ تینوں صورتیں جائز ہیں۔ مصحفی کے مصرع میں آخری لفظ "شعراء" ہے۔ اب یہ کون جانتا ہے کہ مصحفی نے شعراء میں ہمزہ لکھا تھا یا نہیں!

اور لکھا تھا، تو ہمزہ کا ایک عدد شمار کیا تھا یا اسے مہمل چھوڑ دیا
تھا (بے کم وکاست تاریخ کہنے میں مہمل چھوڑ دینے کا امکان کم ہے)
اور یہ ناممکن ہے کہ مصحفی کو نشاط کی تاریخ کا علم نہ ہو۔ ان حالات
میں نشاط کے مصرعے کو ترجیح دی جائیگی۔

اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے تین باتیں فرمائی ہیں:

(الف) مصرع مصحفی نزاعی ہے؛

(ب) کون جانتا ہے کہ مصحفی نے شعراء میں ہمزہ لکھا تھا یا نہیں؛

(ج) نشاط کے مصرع کو ترجیح دی جائیگی۔

ان کی رائے کی بنیاد یہ ہے کہ ممکن ہے مصحفی نے ہمزہ لکھ کر اس سے ایک عدد کا اضافہ کیا ہو اور ان کی مراد بھی (۱۲۳۳) ہی ہو۔

'نزاعی' ہونے کا یہ مطلب ہے کہ کسی نے مصحفی کے مصرعے سے (۱۲۳۲) مراد لیے ہوں اور کسی نے (۱۲۳۳)۔ اس کا بار ثبوت موصوف پر تھا کہ وہ ان مصنفین کے نام لکھتے جنھوں نے اس مصرع سے (۱۲۳۳) برآمد کیے ہیں۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون حضرات ہیں۔

اردو میں عام طور پر عربی کے جمع کے صیغوں میں آخری ہمزہ ساقط ہوتا ہے اور مصحفی نے بھی یہی کیا ہے۔ یوں ڈاکٹر صاحب نشاط کے مصرع تاریخ کو ترجیح دینے میں آزاد ہیں۔ اپنی اپنی پسند ہے! کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے!

(۲) پھر موصوف لکھتے ہیں:

> مالک رام صاحب [اس تحریر کے کاتب کو] انشا کا کوئی قریبی عزیز مانتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہو؛ لیکن اس کے لیے کسی ٹھوس ثبوت کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس تحریر میں جو معلومات مہیا کی گئی ہیں، ان کی موجودگی میں کسی

اور "ثبوت" اور وہ بھی "ٹھوس ثبوت" کی ضرورت کیسے باقی رہ سکتی ہے!
یہ تحریر مشتمل ہے، دو اطلاعات پر! اول انشا کی تاریخ ولادت، اور دوم ان کی تاریخ وفات۔ جس انداز سے اور جن تفصیلات کے ساتھ یہ معلومات درج کی گئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ یہ لکھنے والے کو گھر کے بزرگوں سے ملی ہیں، یا پھر خاندانی یادداشتیں اس کی دسترس میں ہیں۔ خصوصاً تاریخ ولادت یہ جزئیات کسی معمولی شناسا کے بس کی بات نہیں تھی، یہیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ کوئی عزیز قریب ہے۔
یہاں میں ایک احتجاج کرنا چاہتا ہوں:
بعض نئے محقق اور دانشور بڑی بےتکلفی سے لکھ دیتے ہیں کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے؟ اس کے لیے کچھ اور شہادت درکار ہے، یا اس تحریر کا لکھنے والا مجہول الاسم ہے۔ اور ان سب سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم اسے نہیں مانتے۔ اگر اصول یہی ہے، تو دنیا کی بیشتر مسلمہ روایات معرض بحث میں آجائینگی کیونکہ ان کے ساتھ کوئی ثبوت نہیں ہے، نہ ان کے لکھنے والے کا شجرۂ نسب معلوم ہے۔ آخر آپ میر، قائم، قاسم، میرحسن وغیرہم کے تذکروں کے بیانات تسلیم کرتے ہیں اور ان کی سند دیتے ہیں یا نہیں؟ کیوں؟ کیا ان حضرات نے ہر جگہ اپنے بیان کا ثبوت پیش کیا ہے؟ یا اپنے ماخذ کی نشاندہی کی ہے؟ میری اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ آپ ہر کسی کی "ہر ایک بات" بےچون وچرا تسلیم کرلیں۔ بلکہ میرا یہ کہنے سے صرف اتنا مقصود ہے کہ اگر ایک شخص کوئی خدا لگتی بات کہے، جس کے خلاف کوئی معقول وجہ انکار نہ ہو تو اسے مان لیجیے۔ تحقیق وتفحص کا میدان بہت وسیع اور بیکراں ہے۔ اگر کوئی اور حقیقت منظر عام پر آگئی، تو لوگ آج کے مسلّمہ عقیدے پر نظر ثانی کرلینگے۔ اس سے نہ آپ کی کوئی سبکی ہو گی، نہ آپ پر کوئی حرف آئیگا:

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

(۳) اس کے بعد انھوں نے مسیح اللہ خان اور سید عبدالمسیح کے بارے میں دو ڈھائی صفحے (فل اسکیپ) تحریر فرمائے ہیں۔ اور اس طویل تحریر میں ایسی ایسی موشگافیاں کی ہیں کہ باید و شاید۔ ان کے ہر ایک نکتے کا جواب دینا تو مشکل ہے، تاہم دو ایک باتوں کا ذکر ناگزیر ہے۔

فرماتے ہیں:

> جناب مالک رام کا قول ہے کہ "سید عبدالمسیح بظاہر انشا کے علاتی بھائی مسیح اللہ خان کے علاوہ کوئی اور شخص ہیں" لیکن وہ دبی زبان سے یہ بھی فرماتے ہیں: "اگرچہ اس کا بھی خفیف سا امکان ہے کہ مسیح اللہ خان ہی کا گھر کا نام عبدالمسیح رہا ہو۔ اور یہاں انھوں نے اسی لقب سے دستخط کیے ہوں؟" یہ الفاظ جناب مالک رام جیسے مستند اور محتاط محقق کے ہیں، یقین نہیں آتا۔

انھیں میرے مشارٌ الیہ الفاظ لکھنے پر تعجب ہے؛ اور مجھے ان کے اس اظہارِ تعجب پر وا قعی بجد تعجب ہے۔ میری اصلی تحریر اوپر موجود ہے، اور اس کا خلاصہ موصوف نے بھی دیا ہے۔ اسے ذرا پھر ملاحظہ کر لیجیے:

> اس عبارت کے کاتب عبدالمسیح بظاہر انشا کے علاتی بھائی مسیح اللہ خان کے علاوہ کوئی اور شخص ہیں، اگرچہ اس کا بھی خفیف سا امکان ہے کہ مسیح اللہ خان ہی کا گھر کا نام عبدالمسیح رہا ہو اور یہاں انھوں نے اسی لقب سے دستخط کیے ہوں۔

مجھے بتایا جائے کہ اس سے زیادہ محتاط طرزِ تحریر اور کیا ہو سکتا ہے! خود ڈاکٹر صاحب موصوف ہی اس مدعا کو لکھ کر میری رہنمائی کریں۔ کیا الفاظ "خفیف سا امکان" سے زیادہ نرم اور غیر یقینی لہجہ اور کوئی ہو سکتا ہے؟

رہی یہ دلیل کہ میں نے جب یہ لکھا کہ "کاتب کچھ زیادہ تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا" تو یہ بات مسیح اللہ خان سے متعلق نہیں کہی جا سکتی کیونکہ بقول ڈاکٹر صاحب موصوف

> مسیح اللہ خان کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے۔ وہ طبیب تھے، وہ شاعر تھے، انھیں مہابت جنگ کا خطاب ملا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ میر شاہ اللہ خان اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا خاصا خیال رکھتے تھے... لیکن تحریرِ ہذا کا کاتب جو بقولِ مالک رام "کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں"، جاہل معلوم ہوتا ہے۔

اوّل تو "جاہل" اور "زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونا" میں جو فرق ہے، موصوف نے اسے نظر انداز کر دیا ہے اور دونوں کو ایک سمجھ لیا ہے۔ میں نے کسی جگہ یہ نہیں کہا کہ کاتب جاہل ہے۔ رہا ان کا یہ ارشاد کہ کم تعلیم یافتہ ہونے کی بات مسیح اللہ خان کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی تو کیا عرض کروں! میں نے تو صاف لکھا ہے کہ "عبد المسیح بظاہر انشا کے علّاتی بھائی مسیح اللہ خان کے علاوہ کوئی اور شخص ہیں۔" رہا "خفیف سا امکان"، تو گزارش ہے کہ اگر عبد المسیح واقعی مسیح اللہ خان ہی ہوں، تو جو خصوصیات انھوں نے مسیح اللہ خان کی گنوائی ہیں یعنی ان کا طبیب اور شاعر ہونا اور انھیں مہابت جنگ کا خطاب ملنا، ان میں سے کوئی بھی ان کے "زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے" کے منافی نہیں ہے۔ ان کی یہ سب خصوصیات اپنی جگہ ٹھیک ہونگی، لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ وہ صحیح اور بامعنی، مافی الضمیر پر حاوی، فارسی بھی لکھ سکتے تھے! اور یہی یہاں موضوعِ گفتگو ہے۔

میں اگر آج کل کے یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی مثالیں پیش کرنے لگوں، تو کسی آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے۔ ان میں سے کون ہے، جس کے پاس ایم اے (اُردو۔ فارسی) کی سند نہیں! یا جس نے پی، ایچ، ڈی نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود کتنے ہیں، جو ٹھیک اُردو لکھ سکتے ہیں! محض اسناد کا جمع کر لینا تعلیم نہیں کہلاتا؛ اس کے لیے "خدا ئے بخشندہ" کی ودیعت کردہ "سعادت" کی بھی ضرورت ہے۔ مسیح اللہ خان کی جو صفات گنائی گئی ہیں۔ طبیب اور شاعر اور خطاب —— ان سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ

اچھی اور درست فارسی لکھنے پر بھی قادر تھے !

اور لطیفہ یہ ہے کہ قاضی صاحب مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے (اور بظاہر ڈاکٹر صاحب موصوف اس سے متفق ہیں) اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ مسیح اللہ خان کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، ان کی صحت بھی مشکوک ہے۔

(۴) انھوں نے عبدالمسیح کے نام سے متعلق بھی طویل بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ (الف) یہ نام یا عرف مسیح اللہ خان کا نہیں ہو سکتا کیونکہ گھر کا نام یا عرف مختصر ہوتا ہے، نہ کہ پورا نام۔ اور (ب) عبدالمسیح کسی مسلمان کا نام نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے مسیح سے جو عقیدت ظاہر ہوتی ہے، وہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

(الف) گھروں میں، خاص طور پر بڑے مسلمان گھرانوں میں عرف دو طرح کے ہیں۔ ایک نہایت مختصر مثلاً للّن، ببّن، علّن، کلّن وغیرہ

دوسرے پورے نام کی جگہ دوسرا پورا نام۔

مثال کے طور پر غالب کے دو شاگردوں کے نام لیجیے۔ منشی شاکر علی بسمل میرٹھی ثم بریلوی تھے۔ ان کا عرف غلام بسم اللہ تھا، یہ اصلی نام سے بھی طویل تر ہے۔ دوسرے نواب ضیاءالدین خان نیر درخشاں کے چھوٹے صاحبزادے نواب سعیدالدین احمد خان طالب ہیں۔ ان کا گھر کا نام احمد سعید خان تھا، اور وہ اسی نام سے عوام میں بھی مشہور تھے۔ غالب کے شاگردوں میں اور بھی کئی مثالیں ملتی ہیں، جہاں عرف اصلی نام سے طویل تر نہیں، تو برابر تو ضرور ہے۔

مومن کے شاگردوں میں حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی مشہور نام ہے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔ ان کا عرف مولا بخش تھا۔ یہ اصلی نام سے کسی طرح سے مختصر نہیں ہے۔

غرض یہ اصول ہی غلط ہے کہ عرف اصلی نام سے لازماً مختصر ہو گا۔

(ب) یہ کہہ کر کہ عبدالمسیح کسی مسلمان کا نام نہیں ہو سکتا، وہ تضاد کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ عبدالمسیح کو ان کا رشتے دار بھی تسلیم کرتے ہیں، اور اس کے غیر مسلم ہونے پر بھی مصر ہیں۔

کیا انشا کا کوئی رشتے دار غیر مسلم ہوگا؟

اگر وہ عبدالمسیح نام کو غیر مسلم سمجھتے ہیں؛ تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسیح اللہ بھی اسلامی نام نہیں ہے؛ دونوں کے معنی ایک ہیں اور ان سے حضرت مسیح کی الوہیت ثابت ہوتی ہے۔

دراصل اس خاندان کے بیشتر نام کاوا ک سے ہیں۔ کیا ماشاءاللہ یا حسبی اللہ یا تعالی اللہ یا شکر اللہ نام آپ نے کہیں دیکھے یا سنے ہیں بمیرے ایک دوست تفنناً کہا کرتے تھے کہ اگر ان لوگوں کا بس چلتا، تو وہ ضرور کسی بچے کا نام لاحول ولاقوۃ الا باللہ بھی رکھ دیتے۔

میں نے جس خفیف سا امکان کی طرف اشارہ کیا تھا، اس کی وجہ مسیح اللہ خان اور عبدالمسیح دونوں ناموں میں لفظ مسیح کی موجودگی تھی۔ بہرحال مجھے اس پر اصرار نہیں۔ یہ کوئی اور صاحب ہوں گے، لیکن اس سے یہ ایک بات تو ثابت ہے کہ خاندان میں ایک شخص عبدالمسیح نامی تھے۔ وہ اسی نام سے مشہور تھے اور اسی نام سے وہ فرد خاندان تسلیم کیے گئے۔ پس یہ کہنا کہ کسی مسلمان کا یہ نام نہیں ہوسکتا، کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

یہ مضمون بہت طویل ہوگیا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب موصوف نے تمہید میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک قابل توجہ تھی، حالانکہ یہ اصلی موضوع سخن تھا ہی نہیں۔ نفس مضمون (انشا کی تاریخ ولادت و وفات) تک وہ کہیں پانچ فل اسکیپ صفحوں کے بعد پہنچے ہیں۔ میں ان کے ایک اور نکتے کی وضاحت کرنے کے بعد اصلی موضوع سے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

میں نے لکھا تھا کہ "یہ مسیح اللہ خان ہی تھے، جنھوں نے بعد کو انشا کی مشہور تصنیف "دریاے لطافت" اپنے مطبع آفتاب عالمتاب، مرشد آباد میں ٹائپ کے حرفوں میں پہلی مرتبہ ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ء) میں چھاپی تھی۔" موصوف نے دریاے لطافت، طبع اول کا ترقیمہ نقل کیا ہے:

باہتمام عاصی احمد علی گوپاموی ۔ ۔ ۔ ۔ درچھاپہ خانۂ آفتاب
عالمتاب واقع بلدہ مرشد آباد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طبع شد

اور اس کے بعد لکھتے ہیں: "اس ترقیمے سے ظاہر ہے کہ مالک رام کو تسامح ہوا ہے"۔ اس ترقیمے سے مالک رام کا تسامح ظاہر نہیں ہوتا ۔ میں نے لکھا تھا کہ مسیح اللہ خان نے "اپنے" مطبع آفتاب عالمتاب میں دریائے لطافت چھاپی تھی ۔ اس ترقیمے سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ اس مطبع کے مہتمم (مینجر) احمد علی گوپاموی تھے ، بالکل اسی طرح سے جیسے محمد مقتدی خان شروانی ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کے یا موتی لال، منشی گلاب سنگھ کے مطبع رفاہِ عام کے مہتمم (مینجر) ہوا کرتے تھے ۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ مطبع آفتاب عالمتاب مسیح اللہ خان کا قائم کردہ تھا اور ان کی ملکیت تھا ۔ تو میں نے یہ بات مولوی عبدالحق کی سند پر لکھی تھی ۔ وہ "دریائے لطافت" کے اردو ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "سید انشا کی دریائے لطافت ... مسیح الدین خان بہادر نے اپنے نستعلیق ٹائپ کے مطبع آفتاب عالمتاب واقع مرشد آباد میں طبع کی"۔ میں نے خیال کیا کہ مولوی عبدالحق سے غلطی ہوئی ، انھوں نے مسیح اللہ خان کی جگہ مسیح الدین خان لکھ دیا ہو لیکن چونکہ ممکن ہے یہ دونوں الگ الگ شخص ہوں، میں نے یہ فقرہ اپنے مضمون سے حذف کر دیا ہے ۔ یوں بھی یہ بات اتنی اہم نہیں ۔

(۶) خیر اب آیئے نفس مضمون (انشا کی تاریخ ولادت دریافت) کی طرف !

موصوف لکھتے ہیں کہ ہجری سنۂ ولادت کے مطابق (۱۱۰۵) بنگلہ درست نہیں کیونکہ

۱۱۶۶ھ میں جہاں سید عبدالمسیح نے ۱۱۰۵ بنگلہ لکھا ہے" اتھاسک تنتھی پترک" کے مطابق بنگلہ سنہ ۱۱۵۹ تھا ۔ گویا اس میں ۵۴ برس کا مغالطہ ہے ، جس کی کوئی تاویل یا توجیہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ تاریخ وفات میں جسے راوی نے محض ایک سطر میں لکھا ہے ، دن ، تاریخ ، مہینا ، سال سب کچھ درج ہے ۔ لیکن تاریخِ ولادت میں وہ صرف دن مہینا اور سال درج کرتا ہے ، ایک تاریخ لکھنا بھول جاتا ہے ۔ اس کا مطلب ہے ، یا تو وہ انشا کی صحیح تاریخِ ولادت سے واقف

نہیں تھا، یا پھر یہ بھی لغزشِ قلم یا ذہنی غوطہ ہے۔ ان تمام اعداد و شمار کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے، کہ عبدالمسیح کی فراہم کردہ معلومات کہاں تک درست ہیں۔

پہلے ہجری سال کے مقابل بنگلہ سنہ لیجیے۔ اگر بنگلہ سال غلط لکھا گیا ہے، تو اسے اسی حد تک رکھیے یعنی یہ کہیے کہ یہ تقابل غلط ہے۔ اس خاص ہجری سال کے مقابلے میں بنگلہ سنہ یہ نہیں، بلکہ یہ تھا — گویا کاتب سے بنگلہ سال کے اندراج میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ اس نے جو سنہ، ہجری لکھا ہے، وہ بھی غلط ہے۔ بیشک بنگلہ سنہ تسلیم نہ کیجیے، لیکن ہجری سال بھی تسلیم نہ کرکے آپ دوسری غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کاتب کے نزدیک اصلی سال ہجری ہے، بنگلہ نہیں (جیسا کہ اس نے بعد کو عمر کا حساب کرتے وقت ہجری سال کو بنیاد بنا کر ثابت کر دیا ہے) اس نے جو کچھ پرانی یادداشت میں لکھا دیکھا (یا کسی نے اسے بتایا)، اس نے وہ نقل کر دیا۔ اگر اس سے بنگلہ سال کے لکھنے (یا پڑھنے) میں غلطی ہوئی ہے، تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ ہجری سال بھی غلط لکھا گیا ہے۔ پس ہم تسلیم کریں گے کہ ہجری "تاریخ ٹھیک ہے اور بنگلہ غلط (اور یہ بھی اس کی غلطی نہیں ہے، بلکہ اس کی جس نے اسے یہ بتایا، یا جہاں سے اس نے نقل کیا)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کاتب نے واقعی بنگلہ سنہ (۱۱۰۵) لکھا ہی نہیں۔ پہلی مرتبہ اسے پڑھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی میری تقلید میں یہی غلطی کی ہے۔

ذرا عکس کو پھر ملاحظہ کیجیے۔ (۱۱۰۵) کے درمیان جو نقطہ ہے، یہ صفر نہیں، بلکہ اوپر کے لفظ بنگلہ کی (ب) کا نقطہ ہے (یا شاید سنہ کی نون کا) دوسرے لفظوں میں اس نے سال صرف (۱۱۵) لکھ کر چھوڑ دیا ہے، پورا سنہ لکھا ہی نہیں (اس کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں) اس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ جس یادداشت سے اس نے یہ تاریخ نقل کی ہے، وہاں پورا سال درج نہیں تھا، یا اس سے پڑھا نہیں گیا! اس نے یہ تاریخ اپنی واقفیت کی بنا پر نہیں لکھی، بلکہ

جیسی یہ پرانی یادداشت میں کسی نے لکھی تھی (یا کسی بوڑھے بزرگ نے اسے بتائی) اس نے جوں کی توں یہاں درج کر دی۔ لہٰذا اسے یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ اس نے صفر کے مہینے کی تاریخ کیوں نہیں لکھی۔ اس لیے نہیں لکھی کہ اس کے ماخذ میں یہ تھی ہی نہیں۔ یہ نہ اس کی لغزش قلم ہے، نہ ذہنی غوطہ۔ اس کے مقابلے میں تاریخ وفات میں۔ دن، تاریخ، مہینا، سال۔ سب کچھ مکمل ہے، تو یہ اس لیے کہ یہ اس کا اپنا علم ہے۔ واقعہ (غالباً) اس کے سامنے ہوا ہے اور اس کی تفصیلات سے وہ واقف ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۱۶۶ھ کے مطابق ۱۱۵۹ بنگلہ تھا۔ بہت خوب! آپ (۱۱۵) کے آگے ہندسہ (۹) کا اضافہ کر دیجیے، سنہ (۱۱۵۹) ہو جائیگا۔ یہی آپ کا مقصود تھا۔ چشم ما روشن، دلِ ما شاد۔ آپ کا (۵۴) کا فرق پورا ہو گیا۔

صفر کی تاریخ نہ لکھنے کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اصل سے نقل میں سے یہ لفظ (یا ہندسہ) چھوٹ گیا ہو (یا بتانے والے نے نہ بتایا ہو) بہرحال جتنی تاریخ لکھی گئی ہے یہ بھی غنیمت ہے۔

تاریخِ ولادت کا دوسرا جزو ہے: شب یکشنبہ یعنی صبحِ آں شب یکشنبہ روزِ شنبہ پنجگھڑی شب باقی ماندہ"

اس عبارت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ تاہم میں نے جب مضمون لکھا ہے، تو قاری کی سہولت کے لیے عمداً صبح اور شب اور روز تینوں لفظوں کے نیچے کسرۂ اضافت کا اضافہ کر دیا تھا، تاکہ بات بالکل صاف ہو جائے لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب موصوف اسے عجیب بیانی گردانتے ہیں۔

کاتب کا مقصود اس اصول پر مبنی ہے کہ قمری تقویم میں دن ایک غروب آفتاب سے شروع ہو کر اگلے دن کے غروب آفتاب تک ہے۔ یعنی رات پہلے آئیگی اور دن بعد کو، مثلاً جمعرات پہلے ہے اور جمعہ بعد کو۔ اس لیے رات بعد کے دن سے منسوب ہوگی۔ جب ہم شب یکشنبہ کہینگے، تو مراد یہ ہوگی کہ جس دن کے بعد یہ رات ہے اس دن

شنبہ تھا۔ اصولِ مندرجۂ صدر کے مطابق وہ رات شبِ یکشنبہ کہلائیگی، اور اس سے اگلا دن یکشنبہ ہوگا۔ یہی کاتب نے کہا ہے: شبِ یکشنبہ یعنی صبحِ آں شبِ یکشنبہ روزِ شنبہ۔

دوسرے لفظوں میں ولادت ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات میں ہوئی؛ ابھی دن چڑھنے میں پانچ گھڑی باقی تھی۔ پس ولادت صفر ۱۱۶۶ھ میں کسی ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات میں ہوئی، اس کا یقین ہے۔ اس سے زیادہ فی الحال معلوم نہیں۔

(۷) اب لیجیے تاریخِ وفات کو۔ سید عبدالمسیح لکھتے ہیں: سالِ وفات درسیم شہر جمادی الثانی روزِ دوشنبہ ۱۲۳۲ ہجری نبوی۔ گویا وفات پیر ۳۰ جمادی الثانیہ ۱۲۳۲ھ کو ہوئی۔ عام جنتریوں میں جو تقابلی تاریخیں درج کرتی ہیں، جمادی الثانیہ کے ۲۹ دن دیے ہیں۔ دراصل بیشتر جنتریوں میں قمری مہینوں کے اندراج کا یہ انداز ہے کہ ان کے یکے بعد دیگرے (۲۹) اور (۳۰) دن دیے ہیں۔ اگرچہ بعض جنتریوں میں اس کے خلاف بھی ملتا ہے مثلاً REID J.F.M. کی کتاب CHRONOLOGICAL TABLES میں اسی سال ۱۲۳۲ھ کی یہ کیفیت ہے: محرم (۲۹)، صفر (۳۰)؛ ربیع الاوّل (۲۹)؛ ربیع الثانی (۲۹)؛ جمادی الاوّل (۲۹)؛ جمادی الثانی (۲۹)؛ رجب (۲۹)؛ شعبان (۲۹)؛ رمضان (۳۰)؛ شوال (۲۹)؛ ذی القعدہ (۲۹)؛ ذی الحجہ (۲۹)۔ گویا صرف دو مہینوں صفر اور رمضان کے ۳۰۔۳۰، باقی سب دس مہینوں کے ۲۹۔۲۹۔ یوں سال کے (۳۵۰) دن ہوئے، جو کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا؛ اور صریحاً غلط ہے۔ لیکن یہ استثنائی صورت ہے۔ بالعموم ان جنتریوں کے مرتبین نے ایک مہینا (۲۹) دن کا اور اس کے بعد (۳۰) دن کا رکھا ہے۔ لیکن اس طریقے کی غلطی بھی عیاں ہے۔ بسا اوقات یکے بعد دیگرے دو مہینے (۲۹) کے یا (۳۰) کے آجاتے ہیں۔

دراصل قمری مہینے کی ابتدا رویتِ ہلال پر منحصر ہے۔ اگر مہینے کے ۲۹ویں دن چاند نظر نہیں آیا، تو آپ کے جنتری والے لاکھ کہتے رہیں، اگلے دن دوسرے مہینے کی پہلی

تاریخ نہیں ہوگی۔ بلکہ اسی مہینے میں ایک دن کا اضافہ ہو جائیگا، الّا یہ کہ اس دن اس مہینے کی ۳۰ تاریخ ہو۔ اس صورت میں چاند نظر آئے یا نہ آئے، مہینا ختم ہو جائیگا۔ اگلے دن سے نیا مہینا شروع ہو جائیگا۔ کیونکہ قمری مہینا (۳۰) دن سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا۔ مقامی لوگ اسی اصول پر کاربند ہونگے۔

مثال کے طور پر غالب کی تاریخ وفات لیجیے۔

یہ مسلّم ہے کہ وہ دوشنبہ ۲ ذی القعدہ ۱۲۸۵ھ کو فوت ہوئے اور اس دن عیسوی تقویم کے لحاظ سے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء تھی۔ ان کے معاصر اخباروں نے یہی تاریخ شائع کی اور جن لوگوں نے اس زمانے میں ان سے متعلق مضمون لکھے، انھوں نے بھی تاریخ وفات کی یہی نشاندہی کی۔

اب آپ جنتریوں میں دیکھیے، کئی جنتریوں میں آپ کو دوشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے مقابل ۳ ذی القعدہ چھپا ملیگا۔ یہاں آپ کیا تسلیم کریںگے! لازماً ان معاصر شہادتوں کو ترجیح دی جائیگی۔ ان لوگوں نے اس شام چاند دیکھ کر فیصلہ کر دیا کہ یکم ذی القعدہ ۱۲۸۵ھ والے دن ۱۴ فروری ۱۸۶۹ء تھی۔ اب یہ اٹکل سے جنتریاں مرتب کرنے والے لاکھ اس کے خلاف کہیں، ہم ان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔

پس، جب معاصر شہادت سے ثابت ہے کہ انشا کی وفات دوشنبہ ۳۰ جمادی الثانیہ ۱۲۳۲ھ کو ہوئی تو یہ ان لوگوں کی رویت ہلال پر مبنی ہے۔ انھوں نے ۲۹ جمادی الثانیہ کی شام کو چاند نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے انھوں نے مہینے کو ۳۰ دن کا کر دیا۔ جنتریوں والے اپنا حساب لگاتے رہیں (اور اس وقت جنتریاں تھیں بھی کہاں!) ان لوگوں کے حساب سے یہ دوشنبہ کا دن تھا اور ۳۰ جمادی الثانیہ۔

اب اگر آپ ان جنتریوں کی مدد سے عیسوی تاریخ معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کو یہ دونوں بنیادی باتیں تسلیم کرنے کے بعد ہی اگلا قدم اٹھانا پڑیگا۔

ضمناً ایک اور بات بھی ثابت ہوگئی کہ چونکہ سال وفات ۱۲۳۲ھ تھا، لہٰذا مصحفی کی کہی ہوئی تاریخ سے ۱۲۳۲ھ ہی برآمد ہوتے ہیں؛ یہی ٹھیک سال ہے اور ان کی

تاریخ میں 'شعرا' کے آخر میں نہ ہمزہ تھا، نہ اس کا ایک عدد شمار میں آئیگا۔ اسی لیے نشاط کی تاریخ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے، اس میں ایک سال زیادہ ہے۔

ولادت اور وفات کی تاریخوں کے درمیان عاطفہ کی موجودگی کا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ کاتب سے کسی نے انشا کی عمر دریافت کی ہے۔ لہٰذا وہ ولادت کی تاریخ (یادداشت سے دیکھ کر) درج کرتا ہے، اور وفات کی اپنے علم سے؛ اور دونوں کا حساب کر کے آخر میں ان کی عمر چھیاسٹھ برس لکھ دیتا ہے۔ اس حساب کی رُو سے بھی سالِ وفات ۱۲۳۲ھ ہی درست معلوم ہوتا ہے' ورنہ ۱۲۳۳ھ کی صورت میں عمر ۶۷ برس ہوتی۔

(۸) اچھی بیگم سے متعلق میں نے قیاس آرائی کی تھی کہ شاید انشا کی بیوی کا نام ہو۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کہتے ہیں کہ:

> اس کے لیے مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔ ۱۲۲۹ھ میں انشا کی جو بیوی زندہ تھیں، ان کا نام عاشوری بیگم تھا۔

میں اپنی پہلی قیاس آرائی پر ایک اور اضافہ کرتا ہوں۔ یعنی ممکن ہے کہ یہ اچھی بیگم ان کی دوسری بیوی ہو یا شاید عاشوری بیگم ہی کا گھر کا نام اچھی بیگم ہو۔
بہر حال یہ سب قیاس ہیں۔ اور بقول ان کے اس کے لیے مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔ موصوف کوشش کریں، اور اپنی تحقیق جاری رکھیں۔ ممکن ہے، وہ اپنے مطالعے کے دوران میں یہ مزید ثبوت مہیا کر سکیں۔

چیستانِ جرأت

یہ اُردو ادب کی کیسی بدقسمتی ہے کہ آج تک کتنے ہی مسلّم الثبوت اساتذہ کے دیوان شائع نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں اردو ادب کی مکمّل تاریخ ہی کیونکر مرتب ہو سکتی ہے، نظم و نثر کے سرمایہ کی تاریخِ ادب کی تدوین میں وہی اہمیت ہے، جو کسی عمارت کے لیے پتھر، لکڑی یا گارے کی ہوا کرتی ہے۔ انھیں بدنصیب مشاہیر شعرائے اُردو میں جن کے دیوان شائع نہیں ہو سکے، ایک ہستی جرأت کی بھی ہے۔ تمام تذکرہ نگار اس کی مہارتِ فن اور قدرتِ زبان اور لطفِ بیان کے قائل، بلکہ ثنا خواں ہیں، لیکن اس کے باوجود آج تک اس کا مکمّل کلیات زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

ابھی چند دن ہوئے نیپلز (اٹلی) سے جرأت کے کلیات کا پہلا حصّہ جو صرف غزلیات پر مشتمل ہے، موصول ہوا، تو بہت مسرّت ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ پورا کلیات دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ پہلا حصّہ غزلیات کا ہے۔ دوسرا حصّہ جو زیرِ طبع ہے، اس میں قصائد، مثنویات، رُباعیات وغیرہ ہونگی۔ اس کے علاوہ تیسرے حصّے میں مرتب جناب پروفیسر اقتدا احسن مبسوط مقدمہ، تنقیدِ کلام، اختلافِ نسخ اشاریہ وغیرہ شائع کرینگے۔

یہ قابلِ تعریف کام نیپلز (اٹلی) یونیورسٹی کے دائرۂ شرقیہ کے زیرِ اہتمام ہوا ہے۔

خدا کی شان کہ اُردو کا شاعر اور اس کا مکمل کلام پہلی مرتبہ ایک یورپی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو! ہمارے ہاں جرأت کے کلام کے متعدد انتخاب مختلف اوقات میں شائع ہوئے ہیں، لیکن پورا کلام اب پہلی دفعہ ایک جگہ چھپ رہا ہے۔ اتفاقات ہیں زمانے کے۔

کتاب بڑے سائز کے ۶۰۰ صفحات کو محیط ہے اور اس میں ۱۰۹۳ غزلیں ہیں نستعلیق کی خوشخط کتابت، آفسیٹ کی بہترین طباعت بہت عمدہ کاغذ اور مضبوط جلد، اس کی چند خصوصیات ہیں۔ اس پورے دیوان میں گیارہ ہزار شعر ضرور ہونگے، شاید کچھ زیادہ ـــ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو جرأت اپنی سوقیت اور عریانی کے لیے بدنام ہے تو یہ محض مبالغہ اور اتہام ہے۔ بیشک کلیات میں ایسے شعر بھی ہیں۔ لیکن یہ اس دَور کا عام رنگ تھا، بڑے بڑے ثقہ اور سنجیدہ اور متین شاعر بھی ہمیں اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں؛ محض جرأت کو اس گناہ کے لیے مطعون کرنا صریح زیادتی ہے۔ دراصل یہ غلط رائے میر سے چلی اور محمد حسین آزاد کی بیمثل انشا پردازی نے اسے دوام عطا کر دیا۔ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعۂ نغز میں روایت کی ہے کہ مرزا محمد تقی خان ترقی کے مکان پر مشاعرہ تھا۔ جرأت بھی اپنے متعدد تلامذہ کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ جرأت نے کئی غزلیں سنائیں، بہت داد ملی؛ اتنا شور ہوا کہ سمجھنا تو درکنار، سننا تک دشوار ہو گیا۔ حسنِ اتفاق سے مجلس میں میر بھی تشریف فرما تھے۔ حاضرین سے جو وافر داد ملی تو جرأت کی شامت آئی۔ وہ آہستہ آہستہ میر کے پہلو میں پہنچے اور داد طلب ہوئے۔ میر نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا، لیکن جرأت نے اصرار کیا۔ اس پر میر کی "زبانِ تحوت تواماں" پر گذرا: تمھیں اتنا ابرام ہے تو مجبور ہوں۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو"۔ تو گویا یوں میرِ تصدیق ثبت ہو گئی، جرأت کے عامیانہ اور بازاری ہونے پر۔ چونکہ پورا دیوان آج تک چھپا نہیں، اور ہمارے مشرقی مزاج میں مین میکھ نکالنے سے زیادہ

اندھادھند سنی سنائی باتوں پر آمنّا وصدّقنا کہنے کی عادت عام ہے، اس لیے کسی نے تحقیق کی زحمت گوارا نہ کی کہ دیکھا تو جائے کہ آخر میر کی راے مبنی بر انصاف بھی ہے! رہی سہی کسر محمد حسین آزاد نے پوری کر دی اور کہا کہ :

میر صاحب مرحوم شاعروں کے ابوالآبا تھے ۔ کیسے ہی الفاظ میں
فرمائیں، مگر جوہری کامل تھے، جواہر کو خوب پرکھا ۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا ۔

میں سرسری طور پر دیوان دیکھ رہا تھا کہ اس کے ص ۴۷، ۴۸ پر یہ پانچ شعر کی غزل نظر سے گذری :

۱ نشدیں ہمی جنت نب دولا ہمنی یائی	أت بُصع سَقمَ ریتی زنہار ہنی یائی
۲ نس کو رادن "تا قلین با تقل یکا کہبا	کیا ریکی نگی رو یا دَ لستا رہنی یائی
۳ تر قیر رمی تنرک تو بادد متیرک نیو	فمول تجھی أت بک گگتا رہیی یائی
۴۔ نج جلس دنزان نیم بازدیگ ستہان سیتو	باثوت بکھی بر مرپ لستدا رہنی یائی

۵ جرات جتھی چکھ گو رادالی رنج اُجرت
چکھ تیکے رخب صاقد نہزار ہتی یائی

اس رسم الخط میں جتنی زبانیں لکھی جاتی ہیں، میں ان کا حرف شناس ہوں، کسی کا کم کسی کا زیادہ ۔ یہ ان میں سے کوئی زبان نہیں تھی ۔ بہت تعجب ہوا کہ یہ کونسی زبان ہو سکتی ہے ۔ جرأت کے حالات میں کسی تذکرہ نگار نے اس کے اردو فارسی کے علاوہ کسی اور زبان جاننے کا ذکر بھی نہیں کیا کہ اس سے کچھ رہنمائی ملتی ۔ بہر حال اگرچہ میں دوسرے کاموں میں الجھ گیا، لیکن یہ خلش دماغ میں مسلسل قائم رہی ۔

دو چار دن بعد میں نے پھر دیوان اٹھایا، تو لامحالہ اسی غزل پر غور کرنے لگا ۔ اچانک القا ہوا کہ ہو نہ ہو اس میں اردو ہی کے الفاظ کے حروف آگے پیچھے کر کے نئے الفاظ بنا لیے گئے ہیں ۔ جب اصول طے ہو گیا، تو تھوڑی سی محنت سے مندرجۂ ذیل غزل ہاتھ آئی :

۱ شب نیند مجھے تجھ بن دلدار نہیں آئی	تا صبح قسم تیری، زنہار نہیں آئی

۲ سب اوروں کو قاتل نے اب قتل کیا؟ اک میرے گلے اوپر تلوار نہیں آئی
۳ تقریر مری سن کر لولاد و ستمگر یوں معقول تجھے اب تک گفتار نہیں آئی
۴ جب مجلسِ رنداں میں اہد گیے تنزل آکے تابوت کبھی سر پر دستار نہیں آئی
۵ اجرت تجھے کچھ دوں گا، لادے خبر جرأت
کچھ اس کی خبر قاصد! زنہار نہیں آئی

اس کا مطلب یہ ہے کہ مطبوعہ متن میں کتابت کی کچھ اغلاط بھی ہیں اور ایک لفظ معلوم بھی نہیں ہوسکا۔ (شعر ۲)

شعر (۱) کے مصرع اولیٰ میں دو لفظ غلط ہیں: 'تجمی' اور 'دولار'، ان کی جگہ 'جھمی' (جھبی) اور 'دولار' چاہیے۔ مصرع ثانی میں 'رہتی' غلط ہے، درست 'دیتی' ہے۔
شعر (۲) کے مصرع اولیٰ میں ایک لفظ بالکل سمجھ میں نہیں آیا، جہاں میں نے علامتِ استفہامیہ کا نشان دیا ہے، 'کہبا' یقیناً غلط ہے۔ اس کی جگہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ اس میں ایک غلطی اور بھی ہے: 'کو' اون = اوروں کو، گویا ایک واو کم ہے۔
شعر (۳) کے مصرع اولیٰ کے موجودہ متن نے بہت الجھن میں رکھا۔ میں نے پہلے یہ مصرع یوں نکالا تھا:

تقریر مری سن کر دو بالا مسرت کیوں

اور خیال کیا کہ "لوبادو" کتابت کی غلطی ہے، صحیح "لا بادو" ہوگا بعد کو سوجھی کہ "مسترک" کے 'گ' کا دوسرا مرکز ساقط ہوگیا ہے اور صحیح لفظ 'ستمگر' ہے، اور اب مصرع اس طرح ہوگیا۔ جیسا میں نے اوپر لکھا ہے، یعنی

تقریر مری سن کر بولا وہ ستمگر یوں

مقطع کے مصرع ثانی میں لفظ 'سکیے' کو میں نے اول 'کیسی' یا 'کیسے' نکالا تھا، لیکن اس طرح کوئی معنی نہیں بنتے تھے۔ بالآخر میں نے یہ طے کیا کہ یہ بھی غلط کتابت کا کرشمہ ہے، صحیح لفظ 'ساکے' یعنی 'اس کی' ہوگا۔
اتنی محنت کے بعد غزل جب یوں پوری ہوگئی (صرف دوسرے شعر کے مصرع اوّل کا ایک

لفظ سمجھ میں نہیں آیا تھا) کہ معلوم ہوا کہ حل شدہ غزل بھی کلیات مطبوعہ میں موجود ہے۔ اس سے پتا چلا کہ 'کہیا' کی جگہ 'گہیا' چاہیے، جو مساوی ہے، 'ہیگا' کے گویا مصرع ہوگا؛

سب اوروں کو قاتل نے اب قتل کیا ہیگا

مطبوعہ غزل میں بھی کچھ کتابت کی اغلاط راہ پاگئی ہیں، جن کی یہاں نشاندہی کی ضرورت نہیں۔ لیکن مجھے بہرحال اپنی محنت کی داد دینا پڑی کہ میں نے اس چیستان کا ٹھیک حل معلوم کرلیا۔ اور جب تک یہ معما حل نہ ہوجاتا، یہ بھی تو معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کے اگلے ہی صفحے پر اس کا حل چھپا ہوا موجود ہے۔

اقبال کی تاریخِ ولادت

جب ۱۹۷۳ء میں اقبال کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منانے کی تجویز ہوئی، تو لامحالہ ان کی تاریخِ ولادت کا مسئلہ زیرِ غور آ گیا۔ اس سلسلے میں کئی متضاد رائیں سامنے آئیں۔ ان میں سے دو زیادہ متعیّن اور نسبتاً زیادہ قابلِ اعتماد تھیں: اوّل، سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر موالید و اموات کی تاریخ (۲۲ فروری ۱۸۷۳ء)؛ اور دوم، اقبال کی اپنی دی ہوئی تاریخ جو انھوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کے مقالے کے شروع میں مختصر خود نوشت سوانحعمری میں لکھی تھی (۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ)۔ پہلے ان کی داستان سنیے:

اقبال کی وفات (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) کے بعد ان کے مختصر سوانحِ حیات روزنامہ انقلاب، لاہور میں شائع ہوتے تھے۔ اس تحریر میں علامہ کی تاریخِ ولادت ان کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد کے حوالے سے دسمبر ۱۸۷۶ء درج تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کسی شخص نے علامہ کے وطن سیالکوٹ میں وہاں کی میونسپل کمیٹی کا رجسٹر موالید و اموات ملاحظہ کیا اور اس میں شیخ نور محمد (عرف نتھو) کے ہاں ایک لڑکے کی پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کا اندراج دیکھ کر فیصلہ کیا کہ ہو نہ ہو، یہ علامہ اقبال کی ولادت سے متعلق ہے۔ چنانچہ اس نے ادارۂ انقلاب کو اطلاع دی کہ آپ نے علامہ کی جو تاریخِ پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء شائع کی ہے، یہ درست نہیں ہے؛

اصلی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہے، جو میونسپل کمیٹی کے رجسٹروں میں ملتی ہے۔ اس پر انقلاب نے اپنی ۷ مئی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں یہ تصحیح چھاپ دی۔

۱۹۵۵ء میں عبدالمجید سالک مرحوم نے "بزم اقبال"، لاہور کی فرمائش پر علامہ کی سوانحِ عمری "ذکرِ اقبال" مرتب کی۔ انھوں نے بھی سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر کے اسی اندراج (۲۲ فروری ۱۸۷۳ء) کو اقبال کی تاریخ ولادت قرار دیتے ہوئے درج کتاب کر دیا۔[۱] بسبب یہ تاریخ تسلیم کر لی گئی۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں پاکستان سے جو خاص ڈاک ٹکٹ علامہ کے بیسویں یومِ وفات کی یادگار میں شائع ہوا، اس پر یہی تاریخ لکھی گئی۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ، پاکستان نے بھی علامہ کی لاہور اور سیالکوٹ کی قیامگاہوں پر جو کتبے لگوائے، ان میں یہی تاریخ لکھوائی۔ القصہ اگرچہ اب بھی کبھی کبھی دسمبر ۱۸۷۷ء کا ذکر آجاتا تھا، لیکن ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو معاصر شہادت ہونے کی وجہ سے اکثریت کے نزدیک ان کی صحیح تاریخِ ولادت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گئے۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے اپنا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ (ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقاء) انگریزی میں لکھ کر میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پیش کیا۔ حسبِ قاعدہ انھوں نے مقالے کے شروع میں مختصراً اپنے حالات بھی شامل کیے؛ مقالے کی طرح یہ بھی انگریزی میں تھے۔ مقالہ بعد کو چھپ گیا (اور اردو ترجمہ بھی شائع ہوا)؛ لیکن یہ خودنوشت حالات آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، کسی کو معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے اپنے متعلق بھی کچھ لکھا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے مشہور سول سرونٹ ممتاز حسن مرحوم بڑی فعال شخصیت

۱۔ ذکرِ اقبال: ۱۰ (لاہور، ۱۹۵۵ء)

کے مالک تھے۔ وہ جرمن زبان جانتے تھے اور انھیں جرمن لٹریچر سے وسیع واقفیت حاصل تھی۔ انھوں نے کراچی میں ایک ثقافتی ادارہ "پاکستان جرمن فورم" قائم کیا تھا، جس میں مختلف اوقات میں لیکچر ہوا کرتے تھے۔ ممتاز حسن صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ علاّمہ نے ۱۹۰۷ء میں جو مقالہ میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا ادارے کے لیے اس کے اصل کی نقل حاصل کریں۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں اس خواہش کا اظہار اپنے ایک جرمن دوست رچرڈ ہونگ سے کیا، جو جرمنی کے ایک نیم سرکاری ادارے "انٹر نیشن" کے مدیر تھے۔ اس پر ہونگ نے انھیں اصلی مقالے کی متعدد عکسی نقلیں مہیا کر دیں۔ انھیں کے ساتھ علاّمہ کے خود نوشت حالات کی نقل بھی پہلی مرتبہ پاکستان پہنچی،[۲] جس میں انھوں نے صراحت سے اپنی پیدائش "۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ (۱۸۷۶ء)" لکھی تھی۔ یوں یہ مکمل ہجری تاریخ پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی۔ یہ مطابق ہے: ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے (۱۸۷۶ عیسوی سال جو علاّمہ نے توسین میں ہجری تاریخ کے مقابلے میں لکھا ہے، غلط ہے۔ چونکہ یہ تاریخ علاّمہ کی اپنی بیان کردہ تھی (اور یہ انھیں بگمانِ غالب خاندان کے کسی بزرگ نے بتائی ہوگی)، اس لیے اسے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کی تاریخ مندرجۂ صدر پر، جو سالک مرحوم نے "ذکرِ اقبال" میں درج کی تھی، ترجیح دی گئی۔ اور اب عام طور پر لوگ اسے ان کی تاریخِ ولادت تسلیم کرنے لگے۔ خود میں نے بھی اسی تاریخ کو ترجیح دی، اور جب میں نے ڈکشنری آف نیشنل بائیوگرافی (کلکتہ) کی دوسری جلد کے لیے اپنا مضمون "اقبال" قلمبند کیا، تو اس میں ان کی تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی لکھی۔

بظاہر اس کے ساتھ اقبال کی تاریخِ ولادت کا مسئلہ طے ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن تحقیق میں کسی بات پر حرفِ آخر کا حکم لگانا بہت مشکل ہے۔ انھیں دنوں علاّمہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد کے داماد (اور علاّمہ کی ہمشیر طالع بی کے پوتے)

۲۔ مکلوم اقبال (از اعجاز احمد): ۸۵ (کراچی ۱۹۸۵ء)

نظیر احمد صوفی نے دعویٰ کیا کہ (۱) ۲۲ فروری ۱۸۷۳ کو شیخ نتھو کے ہاں پیدا ہونے والا لڑکا انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی غلام محمد کو دے دیا تھا، جن کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی؛ اور (۲) یہ لڑکا کمسنی ہی میں فوت ہو گیا تھا؛ اور (۳) اسی سال شیخ نتھو کے ہاں ایک اور لڑکا ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوا — اور یہی دوسرا لڑکا علامہ اقبال ہیں۔ بعد کو یہی بات زیادہ تفصیل سے ان کے صاحبزادے خالد نظیر صوفی نے اپنی کتاب "اقبال درونِ خانہ" میں شائع کی[۳]۔

چونکہ نظیر احمد صوفی کی حیثیت گھر کے بھیدی کی سی تھی، لہٰذا ان کی بات کو ٹالنا یا نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس سے گویا تاریخِ ولادت کا مسئلہ پھر مشتبہ ہو گیا۔ اب فیصلہ دو تاریخوں کے درمیان کرنا تھا: ۹ نومبر ۱۸۷۷ء اور ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء۔

ان مختلف آرا پر غور کرنے اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے "بزمِ اقبال"، لاہور نے ۱۹۷۲ء میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی کہ وہ تمام شہادتوں کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ علامہ کی تاریخِ ولادت کیا ہے! اس کمیٹی میں ملک کے مشہور صاحبِ علم اور دانشور اور اقبال شناس شامل تھے۔ لیکن یہ کمیٹی ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ ہندوستان میں اقبال کی صدسالہ سالگرہ منانے کی تجویز کا غلغلہ بلند ہوا۔ ایسے میں بھلا پاکستان کی حکومت کیونکر خاموش رہ سکتی تھی! چنانچہ انھوں نے فوراً سرکاری سطح پر ایک کمیٹی بنائی کہ وہ تاریخِ ولادت کی تعیین کرے اور صدسالہ تقاریب اس کے بعد منعقد کی جائیں۔

اس سرکاری کمیٹی کے دو تین اجتماع ہوئے۔ آخری جلسہ یکم فروری ۱۹۷۴ء کو منعقد ہوا، جس میں حسبِ ذیل متفقہ فیصلے کا اعلان کیا گیا[۴]:

> یہ کمیٹی متعلقہ شواہد و قرائن کی چھان بین کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے

۳۔ اقبال درونِ خانہ (از خالد نظیر صوفی): ۱۵۱۔ ۱۶۳ (بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۷۱، ۱۹۸۳ء)

۴۔ مظلوم اقبال: ۸۸

> پیش لفظ میں جو تاریخِ ولادت درج فرمائی ہے، اسے تسلیم کیا جائے۔ علامہ نے اپنی تاریخِ ولادت تین ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ تحریر فرمائی ہے، جو عیسوی سنہ کے اعتبار سے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہوتی ہے۔

اس پر حکومتِ پاکستان نے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء تاریخ ولادت تسلیم کرلی اور اسی کے مطابق ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں صدسالہ تقریب منعقد ہوئی۔
یقیناً کمیٹی نے تمام حقائق اور شواہد کی چھان بین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہوگا۔ آئیے ہم بھی اس مسئلے پر ایک نظر ڈالیں۔

(۲)

علامہ نے اپنے تحقیقی مقالے کے ساتھ جو حالات لکھے تھے، وہ یوں شروع ہوتے ہیں:

> میں ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء) کو سیالکوٹ۔ پنجاب (ہند) میں پیدا ہوا۔ میری تعلیم عربی اور فارسی کی پڑھائی سے شروع ہوئی۔ چند سال بعد میں نے ایک مقامی اسکول میں داخلہ لے لیا، اور یوں اپنی یونیورسٹی (یعنی انگریزی) تعلیم شروع کی۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی کا پہلا پبلک امتحان ۱۸۹۱ء میں پاس کیا

آگے انھوں نے اپنے تعلیمی مراحل کے سنین اور ملازمت کا ذکر کیا ہے، جو فی الحال ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے۔
ان ابتدائی سطروں میں انھوں نے تین باتیں کہی ہیں:

(۱) میری تاریخِ پیدائش ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء) ہے۔
(۲) میری تعلیم کی ابتدا عربی اور فارسی کے مطالعے سے ہوئی۔
(۳) چند برس بعد میں نے ایک مقامی اسکول میں داخلہ لے لیا اور یوں میری

انگریزی تعلیم شروع ہوئی۔

ان تینوں باتوں پر الگ الگ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ ہجری تقویم کے مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ کی تاریخ انھیں کیسے معلوم ہوئی! اس سلسلے میں ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب نے دو بیان دیے ہیں۔ لکھتے ہیں:[۵]

> (۱) دو سال بعد ۱۹۰۷ء میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے لیے مقالہ لکھا۔ چونکہ یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے تھا اس لیے اس کے تعارفی نوٹ میں پیدائش کی تاریخ اور مہینہ بھی لکھنا چاہا، جو انھیں معلوم نہ تھا۔ ظاہر ہے، اس کے لیے اپنے والد کو لکھا ہوگا۔ میاں جی (یعنی شیخ نور محمد) کو تو ان کی تاریخ ولادت ہجری تقویم کے حساب سے ہی معلوم تھی، یعنی ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ، جو انھوں نے تبلادی۔

چند صفحے بعد دوسری جگہ لکھتے ہیں:[۶]

> مقالے کے تعارفی نوٹ میں علامہ کی بیان کردہ تاریخِ ولادت، جو دراصل ان کے والد کی بتلائی ہوئی تھی، ایک وزن دار شہادت ہے۔

گویا پہلی عبارت کا شک اور تذبذب (لکھا ہوگا) چند صفحات بعد یقین میں بدل گیا (والد کی تبلائی ہوئی تھی) لیکن تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ۲۸ سال (یا ۳۲ سال) کی عمر تک انھیں ہندستان کے قیام کے دوران میں، جب وہ ایم اے تک کی تعلیم حاصل کر چکے تھے، اپنی تاریخِ ولادت معلوم نہ ہوئی؛ یہ نہ انھیں ان کے والدین نے بتائی، نہ انھیں نے خود کسی سے دریافت کی۔ اور یہ انھیں جرمنی پہنچ کر ۱۹۰۷ء میں ڈاک کے ذریعے سے اپنے والد سے (؟) دریافت کرنا پڑی

۵۔ ایضاً : ۸۱

۶۔ ایضاً : ۸۹

(اس زمانے میں ہندستان اور ولایت کے درمیان خط وکتابت کرنے کے لیے جو وقت درکار تھا، وہ بھی ملحوظ خاطر رہے)
قوسین میں (۱۸۷۶ء) مقصود بالذات نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی اور اہمیت ہے، لیکن یہاں یہ سال، ہجری "تاریخ کے متبادل کے طور پر لکھا گیا ہے۔ چونکہ یہ غلط ہے، ہم اسے نظر انداز کرنے میں حق بجانب ہیں۔

۲۔ فرماتے ہیں کہ میری تعلیم کی ابتدا عربی اور فارسی کی پڑھائی سے ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل مولانا سالک مرحوم نے دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ اس زمانے میں بقول مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، سیالکوٹ میں ان اصحاب کی زیر نگرانی درس و تدریس کے چار مکتب تھے: (۱) مولوی غلام مرتضیٰ، (۲) مولانا ابو عبداللہ غلام حسین موحد، (۳) مولانا سید میر حسن (۴) مولوی مرتمل۔ ان میں سے پہلی دوسری اور چوتھی درسگاہیں عربی اور دینیات کے لیے مخصوص تھیں۔ تیسرے صاحب یعنی مولانا سید میر حسن کے وہاں عربی اور فارسی ادب کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا۔ شیخ نور محمد اگرچہ عرف عام میں ان پڑھ تھے، لیکن شروع سے علماء و صلحاء کی صحبت میں بیٹھتے اٹھتے آئے تھے۔ اس سے ان کے دل میں تصوف اور اسلامیات سے خاص رغبت اور شغف پیدا ہو گیا تھا۔ یہی باعث ہے کہ جب اقبال پڑھنے کی عمر کو پہنچے، تو شیخ صاحب نے انھیں اپنے محلے کی مسجد حسام الدین میں مولانا غلام حسین موحد کے مدرسے میں قرآن اور دینیات پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ (یہ سالک مرحوم نے لکھا ہے۔ لیکن قرائن یہ ہیں کہ وہ پہلے عمر شاہ صاحب کے مکتب میں قرآن وغیرہ پڑھنے کے لیے داخل ہوئے اور پھر اس کے بعد مولانا غلام حسین کے مدرسے میں گئے۔ عمر شاہ کے مکتب میں کتنے دن رہے، اس سے متعلق کچھ معلوم نہیں۔)

۷۔ ذکر اقبال: ۱۰-۱۱

۸۔ مصنف "اقبال درون خانہ" (ص ۱۶۲) میں اسے مسجد خوالہ والی لکھا ہے، شاید اس کے دو نام ہوں!

مولوی سید میر حسن بھی کبھی کبھی مولانا غلام حسین موحد سے ملنے آیا کرتے تھے۔ یہاں انھوں نے اقبال کو بھی طلبہ میں دیکھا۔ ایک دن انھوں نے مولانا موحد سے پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے؟ بتایا گیا کہ شیخ نور محمد کا اس پر میر حسن صاحب نے خود شیخ نور محمد سے کہا کہ اقبال کو اس مدرسے سے اٹھا لیجیے اور میرے پاس بھیج دیجیے، اسے یہیں پڑھاؤں گا۔ غرض کچھ ٹال مٹول کے بعد اقبال میر حسن کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ یہاں انھوں نے فارسی اور عربی کے متون پڑھے۔ اور جب دونوں زبانوں کا صحیح ذوق پیدا ہو گیا، تو میر صاحب موصوف نے ساتھ سے جا کر ان کا اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں داخلہ کرا دیا، جہاں وہ خود اس دوران میں مدرس مقرر ہو چکے تھے۔[9]

اقبال نے اپنی مندرجہ صدر خود نوشت میں عمر شاہ اور مولانا غلام حسین موحد اور مولانا میر حسن کے مدرسوں میں تعلیم پانے کی مدت "چند سال" (A FEW YEARS) بتائی ہے۔ اور اسکول میں داخلے کو "یونیورسٹی تعلیم" (UNIVERSITY CAREER) کے آغاز سے تعبیر کیا ہے۔

اس بات پر بحث لے دے ہوئی ہے کہ ان مدرسوں میں تعلیم کی مدت کتنی تھی! ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> حقیقت یہی ہے جو علامہ نے خود بیان کی کہ سکول کے داخلے سے قبل "چند برس" انھوں نے مکتب میں بسر کیے اس کی مدت ایک دو برس تھی، یا زیادہ، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ۔ ۔ A FEW YEARS سے مراد "کئی برس" ہے۔ اگر مکتبی تعلیم کے بعد علامہ نے پہلی جماعت میں داخلہ لیا ہو، تو ان کا اور ان کے ہم جماعتوں کی عمر کا فرق ضرور رہیگا۔ اور اگر چند جماعتیں چھوڑ کر براہِ راست اوپر کی کلاس

9. ذکر اقبال: ٢٧۴
10. نقوش، اقبال نمبر (٢)، ١۵ - ١٦

میں داخلہ لیا ہو، تو پھر عمر کے فرق کا امکان باقی نہیں رہتا۔ دوسرے قرینے کے لیے کوئی معاصر یا متاخر شہادت نہیں ۔ ۔ ۔ بالائی جماعتوں میں داخلہ نادرالوقوع ہوتا ہے۔ اگر علامہ نے براہِ راست کسی بالائی جماعت میں داخلہ لیا ہوتا، تو اعزہ و احباب اس کا ذکر ضرور کرتے۔ معاصرین و متاخرین کی خاموشی سے شاید یہ نتیجہ نکالنا خلافِ واقعہ نہ ہو کہ پانچ برس کی مکتب نشینی کے بعد علامہ نے براہِ راست پہلی جماعت ہی میں داخلہ لیا A FEW YEARS کی ترکیب ظاہر کرتی ہے کہ اس کی حدود بخوبی تین برس سے نو برس کے زمانے تک حاوی ہیں۔ اگر محتاط اندازِ بیان اختیار کیا جائے، تو ایک یا دو برس یا تین برس تک کے لیے بھی گنجایش موجود ہے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جسٹس جاوید اقبال لکھتے ہیں:[۱۲]

دراصل اقبال کے تعلیمی ریکارڈ کی سن ۱۸۷۳ء سے مطابقت ہی اُسی صورت ممکن ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ اقبال پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھے، پانچ برس مکتب نشینی میں گزارے اور اردو، فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد دس سال کی عمر میں اسکول کی پہلی جماعت میں داخل ہو کر پھر الف، بے سے ابتدا کی ۔ ۔ ۔ سید میر حسن اسکاچ مشن اسکول میں پڑھاتے تھے، اور انہی کی وساطت سے اقبال اُس اسکول میں داخل ہوئے۔ عین ممکن ہے کہ ذہین اور ہونہار ہونے کے سبب سید میر حسن نے انھیں پہلی جماعت کی بجائے دوسری یا تیسری جماعت میں داخل کرایا ہو ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں اسکول کی پہلی چار جماعتوں میں

۱۱۔ "کئی" ٹھیک ترجمہ نہیں یہ MANY کا ترجمہ ہو سکتا ہے

۱۲۔ زندہ رود ا: ۴۱۔ ۴۲ (غلام علی پبلشرز، لاہور ۔ ۱۹۷۹ء)

بچوں کو سارے کے سارے مضمون اُردو میں پڑھائے جاتے تھے اور انگریزی کی ابتدا عموماً پانچویں جماعت سے ہوتی تھی۔ ان حالات میں کیا یہ قیاس کرنا واجب ہے کہ اقبال نے پانچ سال مکتب میں اُردو فارسی اور عربی پڑھنے کے بعد دس سال کی عمر میں اسکول کی پہلی جماعت سے پھر الف، بے کی تدریس کی ہو گی؟

ڈاکٹر وحید قریشی مُصر ہیں کہ اقبال نے براہِ راست کسی بالائی جماعت میں داخلہ لیا ہوتا، تو ان کا داخلہ نادر الوقوع ہوتا اور وہ اعزہ و احباب سے اس کا ذکر ضرور کرتے۔ لیکن اگر پانچ سال مکتب نشینی کے بعد دس برس کی عمر میں انھوں نے اسکول کی دوسری یا تیسری جماعت میں داخلہ لیا، تو یہ کونسی ذکر کرنے والی بات تھی! .... بہر حال ہمارے پاس اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ مکتبی تعلیم سے فراغت کے بعد اقبال نے اسکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا، بلکہ اقبال کی ذہانت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔

A FEW انگریزی زبان کی ترکیب ہے۔ اس کے معنی انگریزی کے روزمرّہ کے مطابق ہی متعین کیے جائینگے۔ تعجب ہوتا ہے کہ وحید قریشی نے کیسے اس کے معنی "ایک دو برس" یا "اس کی حدود بخوبی تین برس سے نو برس تک" کے لے لیے۔ جو اصحاب انگریزی زبان کے مزاجدان اور اس کے محاورہ شناس ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ A FEW کا اطلاق پانچ سے کم پر نہیں ہوتا۔ اگر دو تین، چار کہنا مقصود ہو، تو دو کے لیے COUPLE کہینگے۔ دو تین (دو یا تین)، تین چار (تین یا چار) کہینگے۔ آپ نے اگر A FEW کا روزمرّہ استعمال کیا ہے، تو لازماً اس کے معنی پانچ یا اس سے زیادہ کے ہونگے۔ یقیناً اقبال اتنی انگریزی تو جانتے ہی تھے!

ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے "تین سے نو" برس تک، ممکن ہے، فارسی کے "اند" سے اشتباہ

کی بنا پر حاوی کیا ہو۔ لیکن یہاں بات انگریزی کی ہو رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں انگریزی کے استعمال کی پیروی کرنا پڑیگی، نہ کہ فارسی کی۔

جسٹس جاوید اقبال نے ایک امکان کا سہارا لے کر عجیب و غریب موشگافیاں کی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اتنے برس کی مکتب نشینی کے بعد "عین ممکن ہے کہ انھیں "پہلی جماعت کی بجائے دوسری یا تیسری میں داخل کرایا گیا ہو"۔ ان کے خیال میں یہ قیاس کرنا واجب نہیں کہ اقبال نے "پانچ سال"[۱۳] مکتب میں اردو، فارسی اور عربی پڑھنے کے بعد دس سال کی عمر میں اسکول کی پہلی جماعت سے پھر الف، بے کی تدریس کی ہو"۔

اس میں دو مغالطے ہیں۔ اول، ان مدارس میں اقبال نے اُردو پڑھی ہی نہیں۔ یہ نہ جب کا دستور تھا، نہ اب ہے۔ ان مدرسوں میں قرآن اور دینیات کے علاوہ اُردو بطور مضمون پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ پس، یہ خیال کرنا کہ عمر شاہ یا مولانا غلام حسین موحد کے مدرسے میں انھوں نے اُردو پڑھی تھی، غلط فہمی سے زیادہ نہیں ہے۔ رہا مولانا سید میر حسن کے وہاں کا زمانۂ تدریس! تو ان کے ہاں عربی اور فارسی متون پر توجہ تھی۔ یہاں بھی اُردو کا سوال نہیں اُٹھتا، اور اگر کچھ ہو گا تو برائے نام سے زیادہ نہیں ہو گا۔ اس لیے، جسٹس جاوید اقبال کا یہ سوال کہ کیا ان دونوں مدارس میں پانچ سال اُردو، فارسی اور عربی پڑھنے کے بعد ان کا پھر الف، بے سے شروع کرنا قرینِ قیاس ہے، بےمحل ہے۔ غالباً کسی اور نے یہ لکھا بھی نہیں کہ انھوں نے ان اساتذہ کے ہاں اُردو بھی پڑھی تھی۔

دوسری بات یہ کہ اسکول میں صرف اُردو ہی نہیں پڑھائی جاتی، بلکہ کچھ اور مضامین کی تعلیم بھی ہوتی ہے جو اُردو کے ذریعے سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر اقبال نے

۱۳۔ "پانچ سال" ! کس نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے ان مدرسوں میں صرف پانچ سال تک تعلیم پائی؟ یہ زائد بھی ہو سکتی ہے اور غالباً ہے۔

ان تینوں جگہوں میں اُردو پڑھی بھی ہوتی تو بقیہ مضامین تو انھیں لازماً پڑھنا ہی تھے اور یہ اسکول میں داخلے اور استاد کے پڑھاتے کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ وہ اسکول کے پہلے درجے میں داخلہ لیتے۔

رہا یہ سوال کہ انھیں اسکول جانے پر پہلے درجے کی جگہ کسی اونچے درجے میں داخلہ مل گیا ہوتا، تو اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے بجا لکھا تھا کہ اگر ایسا ہوتا تو نادر الوقوع ہونے کے باعث اعزّہ و احباب ضرور اسے یاد رکھتے، اور کسی نہ کسی مرحلے پر اس کا ذکر کرتے کہ اقبال کو پہلی جماعت میں پڑھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، انھوں نے تعلیم شروع ہی دوسرے یا تیسرے یا کسی اونچے درجے سے کی تھی۔

جسٹس جاوید اقبال نے درمیان میں ایک لفظ "سے" کا اضافہ کر کے اسے یوں بنا دیا کہ اقبال" اعزّہ و احباب" سے "اس کا ذکر ضرور کرتے"۔ ناظرین دیکھیں کہ ایک لفظ کے اضافے سے معنی میں کتنا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ دونوں فقروں کے فاعل ہی بدل گئے ہیں۔

جسٹس جاوید اقبال کا یہ فرمانا کہ "ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مکتبی تعلیم سے فراغت کے بعد اقبال نے اسکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا"، غلط منطق ہے اور قطعاً ناقابلِ قبول۔ خدا معلوم انھوں نے یہ اُلٹی گنگا کیسے بہا دی ہے! اگر کوئی طالب علم پہلی مرتبہ اسکول میں داخلے کے لیے جاتا ہے، تو حسبِ دستور اسے پہلے درجے میں داخل کیا جائیگا۔ اس کے لیے اسے بعد کو کوئی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ عام رواج ہے، مسلمہ اصول ہے۔ ہاں اگر اس کے برخلاف، اسے پہلے درجے کی جگہ کسی اونچے درجے میں داخل کیا جائے، اور وہ بعد کو یہ دعوٰی کرے کہ عام دستور کے خلاف اسے اونچے درجے میں داخلہ ملا تھا، تو چونکہ یہ عام رواج اور روزمرہ کے مشاہدے کے خلاف بات ہو گی، اُسے اس کا ثبوت مہیا کرنا پڑیگا۔ ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ آج میں نے سورج نکلتے دیکھا، تو ہم اس سے یہ نہیں پوچھینگے کہ کس طرف سے؟ یہ ہمارا

روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ سورج مشرق کی طرف سے نکلتا ہے۔ اس کے کہنے پر ہم یہی خیال کرینگے کہ اس نے سورج مشرق کی طرف سے طلوع ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میں نے سورج مغرب کی طرف سے نکلتے دیکھا، تو ہم فوراً اس سے اس کا ثبوت طلب کرینگے کیونکہ یہ بات غیر معمولی اور عام تجربے کے خلاف ہے۔

پس، اگر اقبال پہلی جماعت میں داخل ہوئے تھے، تو یہ ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوتا آیا ہے، اُن کے ساتھ بھی یہی ہوا ہوگا۔ اس کے لیے ثبوت کیسا؟ لیکن دعویٰ تو جسٹس جاوید اقبال کر رہے ہیں کہ "عین ممکن ہے کہ سیّد میر حسن نے انھیں (اقبال کو)۔۔ پہلی جماعت کی بجائے دوسری جماعت یا تیسری جماعت میں داخل کرایا ہو"۔ تو یہ غیر معمولی بات ہے، وہ اس کا ثبوت فراہم کریں۔

یہاں ضمناً ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے:

۱۸۷۷ء کی تاریخ ولادت کے مدّعی اور مؤیّدان ابتدائی مدرسوں کی تعلیم کا زمانہ کم از کم دکھاتے ہیں کیونکہ دوسری صورت میں عمر کا مسئلہ ان کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک دو برس کی مدت بھی ان پر شاق گذرتی ہے، پانچ چھ برس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے: اگر کوئی پانچ چھ برس کی عمر کا لڑکا کسی علمی یا دینی مدرسے میں سال ایک پڑھے (اور ایک دو سال کی حدبندی کی صورت میں اقبال نے دونوں تینوں جگہ ایک ایک برس بھی نہیں گزارا ہوگا) تو وہ کتنا استفادہ کر سکتا ہے؟ وہاں عربی اور فارسی کے جو متون بھی اس نے پڑھے ہوں، ان کی تعداد اور متن کی مقدار کیا ہوگی؟

روایت ہے کہ مولانا سیّد میر حسن نے شیخ نور محمد سے یہ کہا تھا کہ اقبال کو مولانا غلام حسین موحّد کے مدرسے سے اٹھا لیجیے؛ اور میرے پاس بھیج دیجیے، میں اسے پڑھاؤں گا۔ اگر انھیں چند ماہ بعد اقبال کو اسکاچ مشن اسکول ہی میں داخل کرا دینا تھا، تو مولانا غلام حسین موحّد کے مدرسے میں تعلیم جاری رہنے میں کیا قباحت تھی! اور مولانا

سید میر حسن نے اقبال کو کیا پڑھایا، جس کی خاطر وہ انھیں وہاں سے اٹھوا کے لائے تھے!۔

اسی سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے :

اقبال کو ساری عمر مولانا سید میر حسن سے جو ارادت اور عقیدت رہی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ دیکھیے، ۱۹۰۵ء میں انگلستان جاتے ہوئے ان سے متعلق اپنی نظم "التجاے مسافر" میں لکھتے ہیں :

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہیگا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھِلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو

کیا ایسے عمیق اور دیرپا ارادتمندانہ جذبات چند مہینے یا ایک سال کے تعلقِ تلمذ سے (اور وہ بھی چھ برس کی عمر میں) پیدا ہو جاتے ہیں؟ ایک جگہ انھوں نے اپنے آپ کو سید میر حسن کی تصنیف بھی کہا ہے :

(۳) حسنِ اتفاق سے جسٹس جاوید اقبال کے ایک سوال کا ثبوت مل گیا ہے، جو بقول شیخ اعجاز احمد "ناقابلِ تردید" ہے[14]، یعنی ان کا اسکول کے درجۂ اول میں داخلہ۔ شیخ صاحب موصوف لکھتے ہیں[15] :

ڈاکٹر سید محمود حسین ایم اے، پی، ایچ ڈی گورنمنٹ ڈگری کالج، لیہ میں اُردو کے لکچرار ہیں۔ بقول ان کے تحقیق و جستجو ان کا بہترین مشغلہ ہے خصوصاً ایسے موضوعات کی تحقیق جس پر کسی شخص نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ عرصہ سے وہ علامہ اقبال پر بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ انھوں نے رائے گوپال سنگھ انسپکٹر آف اسکولز، لاہور سرکل کی ۸ اپریل ۱۸۸۵ء کی رپورٹ

۱۴۔ مظلوم اقبال : ۹۰

۱۵۔ ایضاً : ۹۶، ۹۷

ڈھونڈ نکالی ہے، جو سکاچ مشن سکول، سیالکوٹ کے پرائمری حصے کے امتحان کے متعلق ہے۔ جو انھوں نے ۵ ۱۸۸ء میں ماہ اپریل کی ابتدائی تین تاریخوں میں لیا۔ جو طلبا لوئر پرائمری (پہلی جماعت) کے امتحان میں کامیاب ہوئے، ان میں سرفہرست علامہ کا نام ہے۔ اس تحقیق کے متعلق ان کا مقالہ "اقبال کی پہلی جماعت کا نتیجہ" کے عنوان سے اقبال اکادمی، لاہور کے "اقبال ریویو" بابت اگست ۱۹۸۳ء میں شائع ہوگیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ علامہ نے یکم اپریل ۱۸۸۴ء کو اسکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ یہی علامہ کی خود نوشت کے آغاز کی تیسری شق ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے مختلف امتحانوں کی تاریخیں دی ہیں، جو انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے تھے:

۱۔ مڈل کلاس (آٹھواں) : ۱۸۹۱ء
۲۔ میٹرک (دسواں) : ۱۸۹۳ء
۳۔ انٹرمیڈیٹ : ۱۸۹۵ء
۴۔ بی، اے : ۱۸۹۷ء
۵۔ ایم، اے : ۱۸۹۹ء

یہ سب تاریخیں درست ہیں، اور ان کی تصدیق ان اسناد سے بھی ہوتی ہے، جو یونیورسٹی سے جاری ہوئی تھیں اور موجود ہیں۔

ستم یہ ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی تاریخ ولادت درج نہیں ہے۔ صرف (۱) اور (۳) پر عمر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مڈل کی سند کی پشت پر عمر کے خانے میں لکھا ہے: فقط پندرہ سال۔ یہ غالباً اس بیان کے مطابق ہے جو ان کے پہلے درجے میں داخلے کے وقت ان صاحب نے دیا، جو انھیں اسکول میں داخل کرانے کو ساتھ لے گئے تھے۔ اسی بنا پر بعد کی سند (۳) کے "درخواست داخلہ میں دی گئی

عمر کے خانے میں عمر ۱۹ سال دی گئی ہے۔
حیرت ہوتی ہے کہ وہ اصحاب جو ہر طرح کی شہادت کو معمولی سے معمولی عذر پر مشکوک قرار دینے اور رد کر دینے میں تامل نہیں کرتے، ان دونوں سندوں کے ان اندراجات کو الہامی شہادت کا درجہ دے کر ان کی بنیاد پر علامہ کی ولادت متعین کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کرتے! یہ یادداشت کس نے لکھی؟ کس تاریخ ولادت کی بنا پر لکھی گئی؟ اوّل یوم انھیں اسکول میں داخل کرانے والے کون صاحب تھے؟ کیا وہ تاریخ ولادت یا عمر سے واقف ہونے کے موقف میں تھے؟ ان باتوں کی کوئی پروا نہیں۔ لیکن چونکہ یہ عمر ان کے مفروضہ نظریے کے ثابت کرنے میں مفید ہو سکتی ہے، اس لیے یہ سب اعتراضات نظرانداز کر دیے گئے ہیں۔ یہ کہاں کی تحقیق ہے!
جیسا کہ لکھا گیا، ان کے مڈل کے امتحان (۱۸۹۱ء) کی سند پر عمر کے خانے میں ان کی عمر "صرف ۱۵ سال" درج ہے۔ خلافِ معمول تاریخ ولادت کا کہیں اندراج نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب وہ اسکول میں داخل کرائے گئے تھے، تو اس وقت بھی ان کے داخلے کے فارم پر تاریخ پیدائش نہیں لکھی گئی تھی، بلکہ صرف اندازاً عمر کی نشاندہی کی گئی۔ اسکول میں داخلہ یا تو ان کے والد شیخ نور محمد نے کرایا (یا شاید ان کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد نے) یا پھر ان کے عربی فارسی مدرسہ کے استاد مولانا سید میر حسن نے۔ اگر داخلہ والد نے کرایا ہوتا، تو تعجب کا مقام ہے کہ انھوں نے تاریخ ولادت کیوں نہ لکھوائی؛ ان سے زیادہ اس کا جاننے والا اور کون تھا! کم و بیش یہی بات شیخ عطا محمد سے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہاں، اگر داخلہ سید میر حسن نے کرایا، تو ممکن ہے کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں۔ لیکن اس صورت میں جب علامہ کے والد تھوڑے فاصلے پر موجود تھے، تو انھوں نے ان سے یہ کیوں نہ دریافت کی! بلکہ اگر یہ بات ان کے علم میں نہ تھی، تو اسکول جانے سے پہلے انھیں یہ علامہ کے والد سے دریافت کرنا چاہیے تھی۔ انھیں یہ تو معلوم تھا کہ داخلے

کے وقت دوسرے کوائف کے ساتھ تاریخ ولادت بھی پوچھی جائیگی۔ خیر، چونکہ مولانا سید میر حسن خود اسی اسکول میں ٹیچر تھے، اس لیے بظاہر ان کی خاطر کسی نے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی، اور صرف اندازاً عمر کی نشاندہی پر داخلہ ہوگیا۔ یہ بھی محض قیاس ہے؛ خدا معلوم حقیقت کیا ہے؟

یہی عمر ایم، اے (۱۸۹۹ء) کے امتحان تک چلتی رہی۔ لیکن اس سے ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں استدلال کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے! اس عمر کے لکھنے والے کا نام تک معلوم نہیں (یقیناً وہ علامہ کے خاندان کا کوئی آدمی نہیں ہے) اسے خود ان کی تاریخ ولادت کا علم نہیں اور وہ اس کے معلوم کرنے کی معمولی سی کوشش بھی نہیں کرتا۔ ایسے میں اس کا اندازے سے عمر کی نشاندہی کرنا کیونکر قابل اعتماد ہو سکتا ہے!

آئیے، اب معلومہ کوائف کی روشنی میں علامہ کی خود نوشت کا جائزہ لیں:

تاریخ ولادت : ۹ نومبر ۱۸۷۷ء (۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ)
بسم اللہ (عمر ۴ سال، ۴ ماہ، چار دن)[۱۶]: ۹ جنوری ۱۸۸۱ء (۷ صفر ۱۲۹۸ھ)
عربی فارسی تعلیم (۵ برس)[۱۷] : آخر ۱۸۸۵ء تک

۱۶۔ شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ ان کے دادا جان، شیخ نور محمد نے ان کی بسم اللہ اس عمر میں کرائی تھی (زندہ رود: ۵۰، ۱۴۴) اگرچہ یہ کوئی دلیل نہیں کہ بیس برس پہلے بھی یہی کیا گیا ہو، حالات بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اگر وہ شیخ عطا محمد کی بسم اللہ کی تاریخ بتاتے تو وہ زیادہ برمحل اور مفید ہوتی۔

۱۷۔ یہ مدت علامہ کے A few (چند سال) کی کم از کم میعاد ہے، اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ علامہ کے تین استادوں کا ذکر ملتا ہے: عمر شاہ، غلام حسین، سید میر حسن۔ جسٹس جاوید اقبال کے نزدیک (بغیر حوالہ اور ثبوت کے) انھوں نے مولانا غلام حسین کے مدرسے میں ایک سال اور سید میر حسن کے ہاں تین سال تعلیم پائی تھی (زندہ رود: ۵۰، ۵۱)

اسکول میں داخلہ	:	یکم اپریل ۱۸۸۴ء
مڈل اسکول کا امتحان	:	۱۸۹۱ء

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب تک عربی، فارسی مدارس کی تعلیم تین برس تک محدود نہ کی جائے، یہ حساب ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اور یہ خود علامہ کے بیان کے خلاف ہے۔

اب اسے الٹے ہاتھ سے دیکھیے:

مڈل کا امتحان	:	۱۸۹۱ء
اسکول میں داخلہ	:	یکم اپریل ۱۸۸۴ء
عربی فارسی کی تعلیم کا آغاز (یعنی بسم اللہ)	:	۱۸۷۹ء
تاریخ ولادت	:	۱۸۷۴ء

اس سے نومبر ۱۸۷۷ء کی ولادت ٹھیک نہیں ہو سکتی۔

(۳)

اس دوران میں کچھ اور معلومات حاصل ہوئیں جن سے معلوم ہوا کہ تاریخ ولادت نہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہے، نہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء؛ بلکہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے نواسے (اور ان کی بڑی ہمشیر طالع بی کے پرپوتے) جناب خالد نظیر صوفی نے ۱۹۷۱ء میں اپنی کتاب "اقبال درون خانہ" شائع کی۔ اس میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ علامہ کی ولادت نہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی ہے نہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی۔ بلکہ وہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے دفتر موالید و اموات کے بعض اندراجات شائع کیے، جو حسب ذیل ہیں[۱۸]۔

۱۸. اقبال درون خانہ: ۱۵۵

نمبر	تاریخ پیدائش	لڑکی یا لڑکا	ولدیت	محلہ	پیشہ قوم مذہب	اطلاع کنندہ
(۱) ۴۳۳	۹ ستمبر ۱۸۷۰ء	ایک لڑکی	نتھو	چوڑی گراں	کشمیری	رفیق
(۲) ۲۴۰	۲۲ فروری ۱۸۷۳ء	ایک لڑکا	نتھو	کشمیریاں	کشمیری	نتھو
(۳) ۱۰۴۸	۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء	ایک لڑکا	نتھو	چوڑی گراں	مسلمان خیاط	علی محمد ولد غلام محی الدین
(۴) ۹۶۲	۱۴ نومبر ۱۸۷۶ء	ایک لڑکی	نتھو ولد محمد رفیع	کشمیریاں	مسلمان کشمیری	نتھو

انھوں نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:[19]

۱۔ یہ اندراج علامہ کی ہمشیر طالع بی سے متعلق ہے، جو ان سے تین برس بڑی تھیں ان کا انتقال تقریباً ۳۲ برس کی عمر میں ۱۳ جولائی ۱۹۰۲ء کو ہوا۔

۲۔ اس لڑکے کی پیدائش پر علامہ کی والدہ نے اسے اپنے شوہر شیخ نور محمد (شیخ نتھو) کے ایما پر اپنی دیورانی (یعنی شیخ غلام محمد برادرِ خرد شیخ نور محمد) کی جھولی میں ڈال دیا کیونکہ ان کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ قضاے الٰہی سے یہ بچہ شیر خواری کے زمانے ہی میں چل بسا۔

یہی وہ لڑکا ہے، جس کی تاریخ پیدائش پہلے علامہ سے منسوب کی گئی تھی (ذکرِ اقبال: ۱۰)

۳۔ جس لڑکے کا ذکر (۲) پر ہوا اور جسے اس کی والدہ نے اپنی دیورانی کو دے دیا تھا، اس کے بعد اسی سال کے آخر میں یہ دوسرا لڑکا پیدا ہوا۔ یہی علامہ اقبال ہیں۔

۱۹۔ ایضاً : ۱۵۶۔ ۱۶۲

۴۔ یہ علامہ کی ہمشیر کریم بی کی ولادت کا اندراج ہے، جو ان سے تین برس چھوٹی تھیں۔ ان کا ۸۱ - ۸۲ سال کی عمر میں یکم جولائی ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا۔ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر میں یہ وفات ۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو مندرج ملتی ہے۔
سب سے چھوٹی ہمشیر زینب بی سے متعلق رجسٹر میں کوئی اندراج نہیں ملا۔
خالد نظیر صوفی کے ان بیانات پر بہت بحث ہوئی ہے۔ شیخ اعجاز احمد اور جسٹس جاوید اقبال نے اپنی اپنی تحریروں میں ان کے بیشتر بیانات سے اختلاف کیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے جس لڑکی کا اندراج ہے، اسے علامہ کی بڑی بہن طالع بی سے منسوب کیا گیا ہے اور دونوں اس کی صحت تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شیخ نتھو کی سکونت بھی محلہ چوڑی گراں کی دی ہے جہاں علامہ کے خاندان کی رہائش تھی؛ اور اس کا اطلاع دہندہ رفیق ہے، جو شیخ نور محمد (نتھو) کے والد کا نام ہے۔[۲۰]

یہ دونوں دلیلیں خود ان اصحاب کے اپنے قائم کردہ معیار کے مطابق کافی نہیں۔ کیا یہ تحقیق کر لیا گیا ہے کہ چوڑی گراں کے محلے میں کوئی اور محمد رفیق نہیں تھا، جو علامہ کے والد شیخ نور محمد (نتھو) کا نہیں کسی اور نتھو کا رشتے دار یا دوست ہو کیونکہ وہ اس محلے میں اور نتھوؤں کی موجودگی تو تسلیم کرتے ہیں![۲۱]
اس سلسلے میں ایک اور بات بھی یاد رہے کہ اگر یہ رفیق واقعی شیخ نور محمد (نتھو) کے والد رفیق ہی ہیں۔ تو اس اندراج کے وقت ان کی عمر کسی طرح بھی (۷۰) برس سے کم نہیں ہوگی۔ کیا گھر میں خود شیخ نور محمد کے اور دوسرے کم عمر اصحاب کے موجود ہوتے ہوئے ایک ستر سالہ بزرگ کو میونسپل کمیٹی میں رپورٹ کرنے کے لیے بھیج دینا

۲۰۔ زندہ رود: ۳۷؛ مظلوم اقبال: ۹۴
۲۱۔ مظلوم اقبال: ۹۷ (حاشیہ ۱۲)

تعجب کا مقام نہیں ؟

اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں اس اندراج کے طالب۔ بی سے متعلق ہونے کے نظریے کا منکر ہوں۔ بلکہ یہ معترضین کے غیر متعین طریقۂ استدلال کے خلاف احتجاج ہے۔

(۲) اپنی دادی اماں (یعنی والدۂ علامہ اقبال) کے جذبۂ ایثار کی مثال دیتے ہوئے شیخ اعجاز احمد صاحب لکھتے ہیں[۲۲]:

> میاں جی (والد علامہ اقبال) کے چھوٹے بھائی غلام محمد کے ہاں لڑکیاں ہی ہوئی تھیں۔ ان کی اہلیہ کو لڑکے کی بڑی تمنا تھی اور اس لیے وہ بہت دلگیر رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ دونوں بھائیوں کی بیویاں امید سے ہوئیں۔ اس مرتبہ بے جی کو اللہ میاں نے لڑکا عطا کیا اور ان کی دیورانی کے پھر لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کے غم واندوہ کو دیکھتے ہوئے بے جی نے ان سے کہا کہ لڑکا تم لے لو اور لڑکی مجھے دے دو۔ چنانچہ بچوں کا تبادلہ ہو گیا۔ لیکن وہ لڑکا شیر خواری کی عمر ہی میں فوت ہو گیا۔ بے جی نے اپنی گود خالی کر کے دیورانی کی لڑکی پھر انہیں واپس دے دی۔ اللہ تعالیٰ کو شاید بے جی کا ایثار پسند آیا کہ فوت ہونے والے لڑکے کا نعم البدل علامہ اقبال ایسا فرزند عطا فرمایا۔

لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ میونسپل کمیٹی کا یہ اندراج (۲) اسی واقعے سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں جسٹس جاوید اقبال فرماتے ہیں[۲۳]:

> اقبال کے خاندان کے بزرگ اور معتبر افراد اس بات پر متفق ہیں کہ اقبال کی پیدائش سے قبل شیخ نور محمد کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جو شیر خواری کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس بنا پر شیخ اعجاز احمد کی رائے میں اس اندراج کا اقبال کی پیدائش سے کوئی تعلق نہیں، گو فقیر

۲۲۔ ایضاً : ۴۳

۲۳۔ زندہ رود، ا: ۳۶ ۔ ۳۷

> سید وحید الدین بیان کرتے ہیں کہ ان کی تحقیق کے مطابق یہ اندراج شیخ نور محمد کے ہاں ایک لڑکے کی پیدائش کے متعلق ہے، جو اقبال سے تین چار سال پہلے پیدا ہو کر شیر خواری کی عمر میں وفات پا گیا۔ راقم (یعنی جسٹس اقبال) کی رائے میں، جس سے شیخ اعجاز احمد نے بھی اتفاق کیا ہے، شیخ نور محمد کی اولاد سے متعلق ہر دو پیش کردہ اندراج جس میں سکونت والد کے خانے میں محلہ چوڑیگراں درج نہیں مشکوک سمجھا جانا چاہیے۔ اس لیے متذکرہ اندراج کا تعلق اقبال کی پیدائش سے قبل اس لڑکے کی پیدائش سے بھی نہیں جو شیر خوادی کی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ اندراج کسی ایسے بچے کی پیدائش کا ہو جو محلہ چوڑیگراں کی بجائے محلہ کشمیریاں میں سکونت پذیر کسی نتھو کشمیری کے ہاں پیدا ہوا ہو اور جس کا اطلاع کنندہ اس کا والد ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ بدقسمتی سے میں یہاں شیخ اعجاز احمد صاحب کا استدلال پوری طرح سے سمجھ نہیں پایا وہ خود فرماتے ہیں کہ ان کے گھر: "یہ روایت عام ہے کہ علامہ اقبال کی ولادت سے پہلے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جسے ان کی دادی نے اپنی دیورانی کو دے دیا، اور جو شیر خوادی کے زمانے میں فوت ہو گیا۔ خالد نظیر صوفی صاحب نے، میونسپل رجسٹر کی شہادت پر، علامہ اقبال کی پیدائش سے پہلے ایک لڑکے کی نشاندہی کی، جسے وہ یہ لڑکا بتاتے ہیں۔ کرنیل سید وحید الدین کہتے ہیں[۲۴] کہ یہ لڑکا "اقبال سے تین چار سال پہلے پیدا ہو کر شیر خوادی کی عمر میں فوت ہو گیا"۔ اگر ان اصحاب کا نظریۂ ولادت (۱۸۷۷ء) ٹھیک ہے، تو (۱۸۷۳ء) میں اس لڑکے کی ولادت ہونا چاہیے تھی۔ اس صورت میں جناب خالد نظیر صوفی کا یہ کہنا کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء والا ہی وہ لڑکا ہے، عین قرینِ قیاس ہے۔ اگر شیخ اعجاز احمد صاحب اس لڑکے کو بشارۃً الیہ لڑکا تسلیم نہیں کرتے، تو وہ بتائیں کہ یہ شیر خواری

۲۴۔ روزگار فقیر (نقش ثانی): ۲۳۱

کے زمانے میں فوت ہوجانے والا لڑکا تقریباً کس سال پیدا ہوا؟

یہ فیصلہ کر دینا کہ جہاں کہیں محلّہ کشمیریاں کی سکونت درج ہے، وہ اندراج مشکوک ہے، کافی نہیں۔ محلّہ چوڑیگراں اور محلّہ کشمیریاں ایک دوسرے سے متصل ہیں (یا تھے) ایک جگہ دونوں محلوں کا نقطۂ انفصال ہے، یعنی وہاں ایک محلہ ختم ہوتا ہے۔ اور دوسرا شروع ہوجاتا ہے (اس کی مثالیں بڑے شہروں میں عام طور پر مل جاتی ہیں) اگر کوئی شخص محتاط نہیں ہے، تو وہ آسانی سے ایک کی حد کو ذرا لمبا کر کے دوسرے محلّے کی حدود میں داخل ہو جائیگا۔ کمیٹی کے ان اندراجات میں جہاں بھی محلّہ چوڑیگراں کی جگہ محلہ کشمیریاں لکھا گیا ہے، اسے ہم بالکل نظرانداز نہیں کرسکتے۔

رہا یہ کہنا کہ "عین ممکن" ہے کہ یہ اندراج "کسی ایسے بچے کے بارے میں ہو جو محلّہ چوڑیگراں کی بجائے محلہ کشمیریاں میں سکونت پذیر کسی نتھو کشمیری کے ہاں پیدا ہوا ہو" تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ امکانات کا میدان بہت وسیع ہے۔ آپ کسی بڑی سے بڑی مسلمہ حقیقت سے انکار کرنا چاہیں؟ تو اس کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی "امکان" بآسانی پیش کرسکتے ہیں۔

(۳) خالد نظیر صوفی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اندراج علّامہ کی پیدائش سے متعلق ہے۔ بظاہر اس دعوے کے خلاف کچھ کہنا مشکل تھا۔ والد نتھو اور محلّہ چوڑیگراں — دونوں شرطیں پوری ہوگئی تھیں۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا۔[۲۵]

> ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء والا اندراج اس نتھو سے متعلق ہے جس کی سکونت تو محلہ چوڑیگراں میں تھی، لیکن وہ کشمیری نہ تھا بلکہ خیاط برادری سے تھا، جو سیالکوٹ کی ایک معروف برادری ہے۔

شیخ صاحب موصوف نے اس پر حاشیہ لکھا ہے[۲۶]۔ کہ خیاط برادری سیالکوٹ

۲۵۔ مظلوم اقبال : ۹۴

۲۶۔ ایضاً : ۹۶

ہیں بہت مشہور تھی اور اس برادری کے افراد محلّہ چوڑیگراں میں بھی آباد تھے، ان کے بیانات پر شبہہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کوئی یہ بتائے کہ کمیٹی رجسٹر میں "خیاط برادری" لکھا کہاں ہے؟ یہ برادری کا لفظ اضافہ ہے ان معترضین حضرات کا۔ یہ نہ اس بچّے کی پیدائش کے اطلاع دہندہ کے ذہن میں تھا، نہ کمیٹی کے اس کلرک کے، جس نے اسے رجسٹر میں درج کیا۔ وہ سیدھا سادا "درزی" کے معنوں میں نتھو کا پیشہ لکھ رہا ہے، جو اس خانے کے اوپر لکھا ہے: "پیشہ، قوم مذہب" اندراج ہے: "مسلمان، خیاط"۔ کیا شیخ نور محمد (نتھو) درزی نہیں تھے؟ خود شیخ صاحب موصوف نے انھیں "پارچہ دوز" لکھا ہے۔[۲۷] اقبال جب اسکاچ مشن اسکول میں داخلے کے لیے گئے تو والد کا نام "شیخ نور محمد ٹیلر" لکھا گیا۔[۲۸] گویا آپ درزی کی جگہ "پارچہ دوز" (فارسی) لکھ دیں یا "ٹیلر" (انگریزی)، تو یہ منظور ہے لیکن اگر کوئی "خیاط" (عربی) لکھ دے، تو یہ منظور نہیں ہے۔ یا للعجب! سوال یہ ہے کہ جب لکھنے والے نے خیاط برادری لکھا ہی نہیں، تو آپ اپنی طرف سے "برادری" کے لفظ کا اضافہ کرنے کے کس حد تک مجاز ہیں؟ یا حق بجانب ہیں؟

یہ بھی کہا گیا ہے کہ شیخ نور محمد "نتھو ٹوپیاں والے" مشہور تھے، لکھا جاتا تو یہ، نہ کہ خیاط۔ یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ "ٹوپیاں والے" اُن کا عرف ہے، پیشہ نہیں۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے خیاط تھے اور یہی اندراج ہونا چاہیے تھا۔

اس اندراج کے آخری خانے (اطلاع کنندہ) کے نیچے لکھا ہے: "علی محمد ولد غلام محی الدین" اس پر شیخ اعجاز احمد صاحب فرماتے ہیں:[۲۹]

> علی محمد ولد غلام محی الدین جو اس پیدائش کے اطلاع کنندہ ہیں، نہ ہمارے رشتہ داروں میں ہیں، نہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھنے والوں میں، نہ کبھی ایسے نام کے کسی شخص

---

۲۷ - ایضاً : ۲۳

۲۸ - نقوش، اقبال نمبر (۲) : ۲۴

۲۹ - مظلوم اقبال : ۹۷ (حاشیہ ۱۶)

کا نام ہی ہم نے سُنا۔

شیخ صاحب موصوف یہ ۱۹۸۵ء میں لکھ رہے ہیں اور میونسپل کمیٹی کا یہ اندراج ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء یعنی (۱۱۲) سال قبل کا ہے۔ اگر ان کی یہ بات مان بھی لی جائے کہ اس نام کا کوئی شخص ان کے رشتے داروں میں نہیں تھا، تو (۱۱۲) برس پہلے کے خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بارے میں وہ یہ بات اس تحکم سے کیونکر کہہ سکتے ہیں! یہ بات ان کی اپنی ولادت (۱۸۹۹ء) سے بھی (۲۶) برس پہلے کی ہے۔ اور پھر کوئی ضرور نہیں کہ یہ شخص رشتے دار یا ہر روز کا ملاقاتی ہو۔ آپ آسانی سے کمیٹی کے دفتر کی طرف جانے والے کسی شخص سے یہ درخواست کر سکتے ہیں کہ براہِ کرم یہ اطلاع وہاں درج کرا دیں۔ بلکہ مجھے تو علی محمد ولد غلام محی الدین کے اندراج کے انداز سے کچھ اس طرح کا شبہہ ہوتا ہے کہ یہی ہوا تھا۔ اطلاع کنندہ سے متعلقہ کلرک نے دریافت کیا تھا کہ آپ کی کیا رشتے داری ہے؟ اس نے کہا کہ کچھ نہیں۔ اس پر اس نے زیادہ توثیق کی خاطر ان کے والد کا نام پوچھا ہوگا جو اس نے ساتھ ہی لکھ دیا۔ واللہ اعلم۔

غرض، "خیاط" کا لفظ اس اندراج کو مشکوک بنانے کے لیے کافی ہے، نہ اطلاع کنندہ کا نام۔

(۳) چوتھے اندراج پر بھی ایک پہلو سے اعتراض کیا گیا ہے۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں[۳۰]۔

> ۱۴ نومبر ۱۸۷۶ء والا اندراج بھی محلہ کشمیریاں میں رہنے والے نتھو کے متعلق ہے جس کے والد کا نام محمد رفیع تھا اور "اقبال درون خانہ" میں بیان کردہ اس مفروضے کو قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ محمد رفیع سہواً لکھا گیا ہے۔

جناب خالد نظیر صوفی کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ محمد رفیق کی جگہ محمد رفیع سہواً

۳۰۔ ایضاً: ۹۴

لکھا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ "ق" اور "ع" دونوں حلقی حرف ہیں۔ اگر کوئی شخص انھیں صحیح مخرج سے ادا کرے، تو سننے والے کے لیے امتیاز کرنے میں سہو عین ممکن ہے؛ لہٰذا وہ ایک کی جگہ آسانی سے دوسرا حرف لکھ جائیگا۔ کیا علامہ کے والد شیخ نور محمد (نتھو) صحیح مخرج سے یہ حرف ادا کرنے کے اہل تھے؟

القصّہ آپنے دیکھا کہ میونسپل کمیٹی کے ان اندراجات پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، وہ ایسے نہیں کہ ہم انھیں بے چون وچرا درست تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔ ان اندراجات کے حق میں اب بھی ایسے دلائل ہیں کہ ان کے صحیح مان لینے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اور یوں تو اتنی مدت کے پرانے واقعات پر آج کوئی حتمی حکم لگانا دشوار ہے؛ کچھ نہ کچھ قیاس آرائی سے کام لینا ہی پڑیگا۔

(۴)

ہم نے اوپر اپنی گفتگو دستاویزی ثبوت تک محدود رکھی ہے۔ ان میں اہم ترین دو دستاویزیں ہیں: اول، اقبال کی اپنی خودنوشت سوانح عمری اور دوسری سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے اندراجات۔ یہی شواہد و قرائن، حکومتِ پاکستان کی قائم کردہ کمیٹی کے سامنے تھے، جن کی چھان بین کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ علامہ مرحوم ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپنے دیکھا کہ یہ فیصلہ کرنے والوں کے پاس کوئی ایسی دلیل یا ثبوت نہیں جسے ہم حتمی یا ناقابلِ تردید یا بالالتزام شبہہ قرار دے سکیں۔ اس کے برعکس متعدد قوی قرائن موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۷۷ء کی جگہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے، اور یہ تاریخ بھی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء تھی۔

حسنِ اتفاق سے اس سلسلے میں بعض شخصی شہادتیں بھی ملتی ہیں، جن سے ۱۸۷۳ء کی ولادت کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) ڈاکٹر وحید قریشی پاکستانی سرکاری کمیٹی کے رکن تھے۔ انھوں نے اس مسئلے

کے مالہٗ وما علیہ پر غور و فکر کر کے ایک مفصّل اور مدلّل مقالہ شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے اس مسئلے پر مختلف پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کی ہے[۳۱]۔ انھوں نے اس سلسلے میں علامہ کی ایک کم دبیش ہم عمر اور ہم جماعت خاتون کرم بی بی سے ملاقات کی۔ محترمہ کرم بی بی کے بیان کا خلاصہ یوں بیان کیا گیا ہے:[۳۲]

(i) میں اقبال کی بہن کریم بی بی سے کوئی تین چار ماہ بڑی تھی۔ اقبال کی شادی کے وقت میری عمر سترہ سال کی تھی اور اقبال کی انیس برس کی تھی۔

(ii) ایک دفعہ بہت ہیضہ (انفلوئنزا) پھیلا تھا۔ میرا سوتیلا بیٹا فیض اس ہیضے کی وبا میں مرا تھا۔ اس کی عمر انیس برس کی تھی۔ یہ میری شادی سے دو ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ شادی کے وقت میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

(iii) اقبال کی چار بہنیں تھیں۔ بڑی بہن جیونی؛ یہ فضل حق سینڈو کی والدہ تھیں۔ ان کے تعلقات خاوند سے اچھے نہیں تھے۔ یہ میری بڑی بہن بھاگن کی ہم عمر تھی۔ دوسری طالع بی بی تھی۔ تیسری کریم بی بی اور چوتھی زینب بی۔ زینب کی اپنے خاوند سے اَن بَن ہو گئی تھی اور خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی۔

اس کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی نے ان بیانات کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ طے کیا ہے کہ علامہ کی پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء قرار دینے کے قرائن زیادہ وقیع ہیں[۳۳]۔
یہاں ایک بات کا ذکر ضروری ہے:
جسٹس جاوید اقبال نے کرم بی بی کی مندرجۂ صدر شہادت پر تنقید کرتے ہوئے

۳۱۔ مقالہ "علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت" مشمولہ نقوش، اقبال نمبر (۲) ۹۔ ۳۰
۳۲۔ ایضاً: ۲۵
۳۳۔ ایضاً: ۳۰

لکھا ہے:[۳۴]

اقبال کی تاریخ ولادت سے متعلق تحقیقات کے دوران کرم بی بی کا بیان ۱۹۶۷ء میں لیا گیا۔ کرم بی بی بیان کرتی ہیں کہ اقبال کی پہلی شادی کے وقت ان کی عمر بیس برس تھی اور کرم بی بی کی سترہ برس۔ یہ بیان اتنی مدت کے بعد حافظہ کی بنیاد پر دیا گیا اور اتنے عرصے کے بعد یادداشت کا صحیح رہنا بھی ممکن نہیں۔

یہ تنقید اور اُس سے اخذ کردہ نتیجہ حیرتناک ہے۔ معلوم نہیں دنیا کے کونسے قانون شہادت کی کونسی دفعہ کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اتنی عمر کے بعد کسی شخص کی شہادت ناقابل قبول یا ناقابل اعتماد ٹھہرے گی!

آپ نے کرم بی بی کا بیان مختصراً اوپر دیکھا۔ کیا اس سے آپ کو یہ گمان گذرتا ہے کہ کسی کمزور حافظے یا نسیان کے شکار شخص کا بیان ہے؟ انھوں نے تمام متعلقہ اشخاص کے نام جس صراحت سے ٹھیک ٹھیک بتائے ہیں، اور مختلف واقعات کے وقت اپنی اور دوسروں کی عمروں کا تعین کیا ہے (اور ان کے بیانات کی تائید دوسرے ماخذ سے بھی ہوتی ہے) ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ان کا حافظہ درست ہے بلکہ ان کی یادداشت آج کل کے کئی جوانوں اور نوجوانوں سے بہتر اور زیادہ قابل اعتماد ہے۔

(۲) دوسری شہادت اقبال کی پہلی بیوی (کریم بی بی) کی ہے۔ اقبال کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ یہی وہ سال ہے، جس میں انھوں نے دسویں کا امتحان پاس کیا تھا۔ شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں:[۳۵]

ان کی پہلی شادی شروع ۱۸۹۳ء میں ہوئی، جب ان کی عمر ابھی پورے

۳۴۔ زندہ رود (۱): ۴۲

۳۵۔ مظلوم اقبال: ۹۸

سولہ سال بھی نہیں تھی ۔

(انھوں نے اقبال کی عمر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی ولادت کے نظریے کے مطابق لکھی ہے ۔)

اقبال کی پہلی بیوی ان سے دو تین برس بڑی تھیں۔ شیخ اعجاز احمد صاحب ہی لکھتے ہیں:[۳۶]

علامہ کی وفات کے بعد جولائی ۳۸ء میں میرے ابا جان نے اپنے ایک خط میں علامہ کی پہلی بیوی (والدۂ آفتاب اقبال) کے متعلق لکھا کہ وہ علامہ سے دو تین سال بڑی تھیں ۔

پھر اس سے اگلے ہی صفحے پر وہ زیادہ تاکید سے لکھتے ہیں:

علامہ کی پہلی بیوی ڈاکٹر عطا محمد صاحب کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ یعنی جو ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوئیں[۳۷]۔ اسے بھی علامہ جو بقول ان کے بڑے بھائی کے پہلی بیوی سے دو تین سال چھوٹے تھے ، کا سن ولادت ۱۸۷۷ء ہی نکلتا ہے ۔

---

۳۶ - ایضاً : ۹۱

۳۷ - حال آنکہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء ان صاحبزادی کی تاریخِ ولادت ہے ہی نہیں، بلکہ شاید ان کی تاریخِ پیدائش کا کہیں اندراج ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے والد ڈاکٹر عطا محمد کے قیامِ جدّہ کے دوران میں پیدا ہوئیں، اور بقول جلالی مصنفِ "اقبال کی بیوی" (بحوالہ ڈاکٹر وحید قریشی، مضمون محولۂ فوق: ۲۸) دس برس کی عمر تک ہاں رہیں اور والد کے ساتھ وطن واپس آئیں ۔ بدیں صورت ان کی تاریخِ ولادت کا اندراج گجرات میونسپل کمیٹی میں کیونکر مل سکتا تھا ۔ گجرات سے جن اندراجات کی نقول موصول ہوئیں، وہ لڑکیاں عطا محمد صاحب کی حجاز سے واپسی کے بعد پیدا ہوئی ہونگی یہ سب پانچ بہنیں تھیں.

لیکن حقیقت یہی ہے کہ پہلی بیگم اقبال سے دو تین برس بڑی تھیں جسٹس جاوید اقبال بھی لکھتے ہیں[۳۸]:

> شیخ عطا محمد کے ایک خط کے مطابق جو شیخ اعجاز احمد کو تحریر کیا گیا، شادی کے وقت کریم بی، اقبال سے عمر میں دو تین سال بڑی تھیں اور اس بات کی تصدیق اقبال کی بہنوں نے بھی کی ہے۔

بہرحال یہ درست ہے کہ پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ یہ نکاح نامہ شائع ہو چکا ہے اور اس پر تاریخ ۴ مئی ۱۸۹۳ء ثبت ہے[۳۹]۔ ان کی پہلی بیگم (کریم بی) فرماتی ہیں کہ ۱۸۹۳ء میں شادی کے وقت علامہ کی عمر بیس برس سے کچھ کم تھی[۴۰]۔ اور چونکہ وہ خود علامہ سے دو تین برس بڑی تھیں؛ گویا ان کی عمر ۲۲۔۲۳ برس کی ہوگی۔ ایک تو بیوی اور دوسرے بالغ عمر! ان کی شہادت ایسی نہیں کہ ہم اسے آسانی سے نظرانداز کر سکیں۔ اگر وہ ۱۸۹۳ء میں بیس سے کچھ کم تھے؛ تو انھیں لازماً ۱۸۷۳ء میں پیدا ہونا چاہیے۔

(۳) علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے چھوٹے داماد جناب نظیر صوفی (والد خالد نظیر صوفی) کا ایک مضمون علامہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت کیا ہے؟ اخبار جہان، کراچی میں شائع ہوا تھا[۴۱]۔ اس مضمون میں انھوں نے علامہ کے بعض معاصرین کے حلفیہ بیانات بھی شامل کیے تھے۔ ان میں سے دو درج ذیل ہیں[۴۲]:

> میں عبدالحق۔۔ ولد خواجہ محمد فاضل مرحوم ساکن میانہ پورہ، حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ میرے والد خواجہ محمد فاضل ولد خواجہ عبدالکریم مرحوم علامہ کے دوست

۳۸۔ زندہ رود، ۱: ۴۷؛ نیز دیکھیے، روزگارِ فقیر، ۱: ۲۳۹

۳۹۔ پاکستان ٹائمز (انگریزی روزنامہ، لاہور) ۱۲ جولائی ۱۹۶۴ء (بحوالہ زندہ رود (۱)، ۴۷)

۴۰۔ اقبال درونِ خانہ: ۱۴۱

۴۱۔ دراصل یہی مضمون "اقبال درونِ خانہ" کے باب "تاریخ پیدائش" کی بنیاد ہے۔

۴۲۔ تماہی تحریر (۳۳) نئی دہلی: ۵۰۔۵۱

اور ہم جماعت تھے۔ میرے والد ۱۹۱۸ء میں ۴۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ وہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور علامہ سے چند ماہ بڑے تھے۔ وہ پہلے مدرسے میں چند سال رہے؛ پھر سکاچ مشن اسکول میں داخل ہو کر علامہ کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں دسویں کلاس کا امتحان تقریباً ساڑھے انیس سال کی عمر میں پاس کیا (تحریر مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۳ء)

(iii) میں خواجہ محمد مسیح ولد خواجہ عبدالعزیز مرحوم صدر برادری کشمیریاں سیالکوٹ حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ ستمبر ۲۹ ۱۹ء میں علامہ کے استاد شمس العلما مولوی میر حسن مرحوم کو دفنانے کے بعد واپسی پر مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی اور علامہ اقبال کی گفتگو کے دوران، ان کی زبانی سنا کہ وہ دونوں اس وقت پچپن چھپن سال کے ہو چکے تھے۔ البتہ مولوی ابراہیم مرحوم نے فرمایا کہ وہ علامہ سے کوئی چار ماہ چھوٹے تھے۔ دونوں دوستوں نے ایف، اے کا امتحان ۱۸۹۵ء میں اکٹھے پاس کیا تھا۔ مولانا مرحوم اپنی خود نوشت سوانح کے مطابق اپریل ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے تھے (تحریر مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۷۴ء)

ان اصحاب کو غلط بیانی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آدمی جھوٹ بولتا ہے، خوف سے یا کسی لالچ سے۔ یہاں ان دونوں باتوں میں سے کسی کا شائبہ بھی نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ یہ لوگ اپنی اہمیت جتانے کی خاطر ایسا کر رہے ہوں۔ یاد رہے کہ ان کی اپنی بیگم بھی اس میں شامل ہیں۔

(۵)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو تاریخ ولادت تسلیم کرنے سے ان کی ابتدائی زندگی کی کئی کڑیاں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ آئیے اب مندرجۂ صدر

معلومہ تفاصیل کی روشنی میں؛ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو بنیاد مان کر توقیت کی تشکیل کریں، اور دیکھیں کہ صورت حال کیا ہے!

۱۔ پیر ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء
(۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ)^۴۳ : ولادت، سیالکوٹ

۲۔ اتوار، ۱۷ مارچ ۱۸۷۸ء
(۱۳ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ) : بسم اللہ اور مدرسہ نشینی
(شیخ اعجاز احمد صاحب کی روایت کے مطابق بسم اللہ چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر میں ہوئی ہوگی)

۳۔ ۱۷ مارچ ۱۸۷۸ء تا
یکم اپریل ۱۸۸۴ء (چھ برس): عربی اور فارسی کی تعلیم
(یاد رہے کہ علامہ نے تین تین عالموں کے مدرسوں میں تعلیم پائی۔
مولوی عمر شاہ اور مولانا غلام حسین موحّد اور مولانا سید میر حسن۔
میرے خیال میں انھوں نے عمر شاہ اور سید میر حسن صاحبان کے ہاں زیادہ دن گزارے، مولانا غلام حسین موحّد کے ہاں وقفہ زیادہ نہیں رہا ہوگا۔ سید میر حسن جلد ہی شیخ نور احمد سے کہ کر انھیں اپنے ہاں اٹھا لے گئے۔
بہر حال یہ ساری مدت تقریباً چھ برس بنتی ہے اور یہ علامہ کے اپنے بیان A FEW کے مطابق ہے۔)

۴۔ یکم اپریل ۱۸۸۴ء : اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ کے درجۂ اوّل میں داخلہ

۴۳۔ عیسوی اور متبادل ہجری تاریخوں کے لیے میں نے INDIAN EPHEMERIS (A.D. 1800 to A.D. 2000) BY DEWAN BAHADUR L.D. SWAMIKANNU PILLAI استعمال کی ہے

۵۔ ۱۸۹۱ء ۔ مڈل کا یونیورسٹی امتحان پاس کیا

(اس کے بعد کے سنین ہمیں معلوم ہی ہیں)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء تاریخ ولادت تسلیم کر لینے سے علامہ کی زندگی کے تمام معلومہ کو اُلف اپنی اپنی جگہ پر کسی جھول کے بغیر ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ یہی اس تاریخ کے درست ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ روایت اپنی جگہ! تاریخ و سیر کی تدوین میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ درایت کی کسوٹی پر پوری نہ اُترے، تو ہمیں لامحالہ اس کی تاویل کرنا اور درایت کو ترجیح دینا پڑے گی۔

بعض روایتوں کی تاویل کے لیے میں نے عمداً کوئی تجویز پیش نہیں کی۔ اصحابِ نظر خود غور کر سکتے ہیں۔

(۶)

اقبال ہماری زبان کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں: فلسفی، مفکر، ماہرِ علم و فن، معمارِ ملک و ملت، سیاستدان۔ ایسے اشخاص کسی ایک عہد میں محدود نہیں کیے جا سکتے؛ وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہوتے ہیں۔ پس اگر ہمیں ان کی تاریخ ولادت و وفات نہ بھی معلوم ہوں، تو اس سے نہ ان کی ذاتی عظمت میں کوئی کمی ہوتی ہے، نہ ہماری ارادت و عقیدت میں کوئی فرق پیدا ہوتا ہے۔ آخر سیکڑوں انبیائے کرام، ائمۂ دین، ہادیان و رہبرانِ بنی نوعِ انسان اور اساتذۂ علوم کی ولادت و وفات کی تاریخیں ہمیں معلوم نہیں، تو کیا اس سے ان کے لیے ہمارا جذبۂ عقیدتمندی یا احسانمندی کم ہو گیا!

اقبال کا کلام ہمارے سامنے ہے۔ ہم آج تک اس سے لذت اندوز اور مستفید ہوتے رہے اور رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ وہ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۸۷۳ء میں یا ۱۸۷۷ء میں۔ لیکن جب ہم حقائق کی دنیا

میں آئینگے اور حد بندی کرنا چاہینگے کہ وہ فلاں دن پیدا ہوئے یا فلاں دن فوت ہوئے، تو اب لابد ہے کہ ہم خیالات اور جذبات سے بالاتر ہوکر حقیقت دریافت کریں اور بلا خوفِ لومۃ لائم اس کا اعلان کر دیں۔

حکومت پاکستان نے ایک کمیٹی ان کی تاریخ ولادت متعین کرنے کے لیے مقرر کی۔ کمیٹی کا دعویٰ ہے کہ وہ "شواہد و حقائق کی چھان بین کے بعد" اس نتیجے پہنچی کہ علامہ کی خود نوشت میں مندرج تاریخ ولادت (۹ نومبر ۱۸۷۷ء / ۳ ذی القعدہ ۱۲۹۴ھ) ہی صحیح ہے۔ حال آنکہ ہوا یہ کہ انھوں نے روزِ اول سے یہ فیصلہ کر رکھا تھا، کہ علامہ نے جو تاریخ لکھی ہے، وہی صحیح ہے اور بقیہ سب غلط ہیں؛ اور ہمیں انھیں غلط ثابت کرنا ہے۔

کمیٹی کے تحت الشعور میں دو باتیں تھیں: اول، علامہ نے خود نوشت میں تاریخ ولادت ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ دی ہے اور وہ غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ اور دوم، ان کا سا عبقری اور نابغۂ عہد دسویں درجے کا امتحان ۱۹۔۲۰ برس کی عمر میں پاس کرے، یہ ناممکن ہے۔ حال آنکہ بنیاد ہی غلط تھی۔ اول، ذی القعدہ ۱۲۹۴ھ ان کی دی ہوئی تاریخ ہی نہیں۔ کوئی شخص بھی اپنی تاریخ ولادت کا شاہد نہیں ہو سکتا۔ اسے جیسا کسی نے بعد کو بتا دیا، وہ اس کو علم ہو گیا۔ کیا کوئی شخص یقین سے دعویٰ کر سکتا ہے یا بتا سکتا ہے کہ علامہ کو یہ تاریخ کس نے بتائی تھی؟ سب قیاس آرائیاں ہونگی۔

رہا دوسرا مفروضہ! تو یہ بھی غلط ہے۔ کسی شخص کی ذہانت اور متانت کے جوہر اس کے اسکول جانے اور تعلیم پانے کے بعد ہی تو کھلینگے۔ اگر کوئی طالب علم اسکول ہی دس برس کی عمر میں جائے، تو لازماً اُسے دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے میں دس برس لگ جائینگے، اور اس کی عمر بیس برس کی ہو جائیگی۔ اس میں اس کا کیا قصور ہے! اور اس سے اس کی ذہانت پر کیا حرف آ سکتا ہے!

یہ لوگ گھر کا ماحول بھول جاتے ہیں۔ علامہ کے والد شیخ نور محمد کی تعلیم کہیں نہیں ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا، اپنے زورِ بازو سے، اور اہل اللہ اور علما کی صحبت میں

بیٹھے بیٹھے کر۔ مرورِ زمانہ سے ان کا مزاج مذہب اور تصوّف کی طرف مائل ہوگیا۔ لیکن ان کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد کو کوئی تعلیم دلوا سکتے ہیں توفیقِ الٰہی سے انکار نہیں کرتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ لیکن خاکم بدہن، علامہ اقبال عطیہ ہیں شیخ عطا محمد اور مولانا سیّد میر حسن کا! ایک کی مالی امداد اور دوسرے کی علمی سرپرستی نے ہمیں اقبال عطا کیا۔ فالحمدللہ۔ ورنہ جیسے وہ مولانا غلام حسین موحّد کے مدرسے میں تعلیم پا رہے تھے، وہاں سے فارغ ہو کر مولوی محمد اقبال بن جاتے، یا بڑے بھائی کی طرح ملازم ہو گئے ہوتے۔ دسویں کے بعد اتنی جلد ان سے عمر میں بڑی لڑکی کے ساتھ ان کی شادی کر دینے کی تہ میں بھی یہی خواہش اور امید کام کر رہی تھی کہ شاید انھیں بھی ان کے خسر ڈاکٹر عطا محمد کی وساطت سے (جو سرکاری ملازم تھے) کوئی ملازمت مل جائیگی۔

غرض ان حالات میں ناگزیر تھا کہ وہ اسکول میں دیر سے داخلہ لیتے اور یہی ہوا۔ پس، اگر انھوں نے دسویں درجے کا امتحان تقریباً بیس برس کی عمر میں پاس کیا تو اس کے لیے ہیں معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کمیٹی کے کام کی جو روداد ہم تک پہنچی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے اراکین میں سے ایک صاحب بہت مستعد اور طلیق اللسان محقق تھے۔ انھوں نے بقیہ اراکین کو (اپنے دلائل و براہین میں) کچھ ایسا الجھایا کہ ان حضرات کے لیے ہتھیار ڈال دینے کے سوائے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ یوں بھی یہ اصحاب پہلے سے اسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے نیم آمادہ تو تھے ہی، ان صاحب کے زوردار دلائل نے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مہیا کر دیا۔

میں خوب جانتا ہوں کہ یہ مضمون صدا بصحرا سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء تاریخ ولادت حکومت کی سطح پر تسلیم کی جا چکی ہے اور ہر سال ۹ نومبر کو یوم ولادت منایا جاتا ہے۔ کون اب اس پر نظرِ ثانی کرے گا، یا ایسا کرنے کی جرأت کرے گا!

ہفتہ وار کوہ نور، لاہور

ہمارے ہاں جدید قسم کے اخبار اور اخبار نویسی کا رواج انگریزوں کے اس ملک میں آنے کے بعد شروع ہوا۔ اس میں اب کوئی شبہ نہیں کہ اُردو کا سب سے پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" تھا۔ دراصل یہ ایک ہفتہ وار فارسی پرچہ تھا جو غالباً مئی ۲۲ ۱۸ء میں منشی سدا سُکھ کی ادارت میں کلکتے سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو اُردو داں طبقے نے مطالبہ کیا کہ فارسی کے ساتھ اُردو کا ضمیمہ بھی شائع ہوا کرے۔ اس مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے "جامِ جہاں نما" کے منتظمین نے اگلے ہی سال یعنی ۱۸۲۳ء سے اس کے ساتھ اُردو ضمیمے کا اضافہ کر دیا۔ اس میں فارسی حصّے کے آٹھ اور اردو ضمیمے کے چار صفحے تھے۔ لیکن اُردو حصّے کے خریداروں کی تعداد زیادہ نہیں رہی، خاص طور پر بنگال میں جہاں فارسی کا زیادہ رواج تھا۔ اس لیے اُردو گھاٹے کا سودا تھا۔ بالآخر منتظمین نے اُردو حصے کی اشاعت ترک کر دینے کا فیصلہ کیا۔ آخری اُردو ضمیمہ ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو نکلا تھا۔ اس کے بعد بارہ صفحوں پر مشتمل پورا پرچہ فارسی ہی میں نکلتا رہا۔ اس کا چندہ تین روپیہ ماہانہ تھا۔

"جامِ جہاں نما" کی دیکھا دیکھی کلکتے ہی میں اور بھی فارسی اور اُردو کے مشترک اخبار چھپنے لگے۔ صرف اُردو کے اخباروں کا چلن دلّی اور پنجاب سے ہوا۔ دلّی کا "دہلی اردو اخبار"

اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا، جسے مدتوں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر شائع کرتے رہے۔

پنجاب میں غالباً سب پرچوں کی زبان اردو رہی۔ یہاں سے شائع ہونے والے پرچوں میں ہفتہ وار "کوہِ نور" کو کئی لحاظ سے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور اور مقبول اخبار تھا۔ یہ ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو لاہور سے جاری ہوا شروع میں اس میں چھ ورق ہوا کرتے تھے۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے بھٹناگر کانستھ سکندرآباد (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ جہاں سے نقل مکان کر کے وہ لاہور چلے آئے، اس سے پہلے وہ "جامِ جمشید" میرٹھ کے مہتمم کی حیثیت سے کام کر کے اخباری تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ ان کا یہاں لاہور کے اعمائدین میں شمار ہوتا تھا۔ وہ لاہور کی علمی اور ادبی، معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ جنوری ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر جی۔ و۔ لائٹنر پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور کے ایما پر بلکہ ان کی سرپرستی میں ایک تہذیبی انجمن کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کارِخیر کی تکمیل کے لیے لاہور کے سربرآوردہ شہریوں کا جلسہ بلایا گیا جس میں مختلف فرقوں کے تقریباً ۸۰ اصحاب شریک ہوئے، منشی ہرسکھ رائے بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ انجمن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کا نام تجویز ہوا: انجمن مطالب مفیدۂ پنجاب۔ لیکن عوام اتنے لمبے نام کے کیونکر روادار ہو سکتے تھے! رفتہ رفتہ اس کا نام صرف "انجمن پنجاب" رہ گیا۔ یہی وہ انجمن ہے جس کے زیرِ اہتمام اُردو کا جدید رنگ کا پہلا مشاعرہ مولانا محمد حسین آزاد نے ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو کیا تھا۔ اس انجمن کے عہدے داروں کا انتخاب اس صورت سے ہوا تھا:

صدر: پنڈت من پھول؛ منشی ہرسکھ رائے، سکریٹری فارسی؛ بابو نوین چندر، سکریٹری انگریزی۔ مجلس عاملہ کے چار اراکین میں ان تینوں عہدہ داروں کے علاوہ ڈاکٹر لائٹنر بھی تھے۔ اس سے منشی ہرسکھ رائے کی لاہور کے تہذیبی حلقوں میں اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

بعد کو اس انجمن میں دلی کے سرکردہ اصحاب بھی حصہ لینے لگے تھے۔ چنانچہ اس کے دوسرے ہی جلسے میں ماسٹر رام چندر، مرزا علاء الدین احمد خاں علائی والیِ لوہارو اور مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کے نام بھی ملتے ہیں۔

"کوہِ نور" شروع میں ہفتہ وار رہا، لیکن اپنی ہردلعزیزی کے باعث اگلے ہی برس یعنی ۱۸۵۱ء میں یہ ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہونے لگا۔ لیکن یہ سہ روزہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور جلد ہی یہ پھر ہفتہ وار چھپنے لگا۔ منشی ہرسکھ رائے نے اخبار ہی کے نام پر مطبع کوہِ نور بھی قائم کیا تھا۔ دونوں کا دفتر لاہور کے ٹکسالی دروازے کے اندر تھا۔ اس مطبع سے وہ اخبار کے علاوہ کتابیں بھی چھاپتے رہے۔ اخبار کی مقررہ قیمت ۱۸ روپے سالانہ تھی، البتہ پیشگی قیمت دینے والوں سے ۱۲ روپے لیے جاتے تھے۔

اس اخبار کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ابتدا میں منشی نولکشور بھی اس سے وابستہ رہے۔ وہ اس کے منیجر بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں انھیں صرف دس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ بعد کو وہ "کوہِ نور" کی ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ اخبار اور مطبع کا یہ تجربہ ان کے بہت کام آیا۔ لکھنؤ سے انھوں نے اپنا ذاتی "اودھ اخبار" جاری کیا۔ ان کے نولکشور پریس نے علم و ادب کی جو خدمت کی ہے، اس سے کون پڑھا لکھا واقف نہیں۔ اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابوں کی بدولت منشی نولکشور نے ہندستان میں اور ہندستان سے باہر بھی لازوال شہرت حاصل کی۔ ان کے خلوص اور دیانت اور محنت کی برکت تھی کہ جب وہ مرے ہیں تو ان کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔

"کوہِ نور" بہت دن تک جاری رہا۔ بلکہ ۱۸۸۳ء میں تو شاید یہ روزانہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کب بند ہوا!

وقتاً فوقتاً جو لوگ اس کی ترتیب میں شریک رہے ان میں بعض مشہور مصنفوں کے نام ملتے ہیں مثلاً مولوی سیف الحق ادیبؔ دہلوی، مولوی محمد دین فوق، مولوی

محرم علی چشتی وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوگا کہ پرچہ ہندو مسلم ادیبوں میں یکساں مقبول تھا۔

(۲)

کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک دوست کی نوازش سے کوہ نور کی جلد ۹ یعنی ۱۸۵۹ء کے آخری سات پرچے اور جلد ۱۰ یعنی ۱۸۶۰ء کے ۴۶ شمارے دیکھنے کو ملے؛ ۱۸۶۰ء کی جلد کے ابتدائی ۶ شمارے موجود نہیں۔ ان پرچوں کے دیکھنے سے جو کوائف معلوم ہوئے، انھیں بیان کرتا ہوں:

۱۔ پرچہ ہر شنبے کو شائع ہوتا تھا۔

۲۔ اس کی ضخامت مقرر نہیں تھی؛ بعض شمارے صرف دس صفحے کے ہیں اور بعض ۳۵۔۴۰ کے بھی۔

۳۔ صفحات مسلسل تھے، جلد ۹ (۱۸۵۹ء) ۸۳۷ صفحات پر ختم ہوتی ہے اور جلد ۱۰ (۱۸۶۰ء) ۸۹۳ پر۔

۴۔ اخبار کی قیمت دو گونہ تھی؛ پیشگی دینے والوں سے ماہانہ ایک روپیہ، ششماہی ۷ روپیہ اور سالانہ ۱۲ روپیہ لیے جاتے۔ جو اصحاب چندہ بعد کو ادا کرتے تھے، ان سے وہ کچھ مزید رقم یعنی صرف ان سے علی الترتیب ۱۳ روپیہ ۱۰ روپیہ اور ۲۴ روپیہ لیے جاتے تھے۔

اس میں محصول ڈاک بھی شامل تھا۔ جنوری ۱۸۶۱ء میں ڈاک کے محکمے نے یہ قاعدہ نافذ کیا کہ آیندہ اخبارات ڈاک کا محصول پیشگی ادا کرینگے، تو انھوں نے چندہ بڑھا کر ۲۰ روپے سال کردیا۔

۵۔ خاص مفید مضامین کی اُجرت بحساب ۲ آنہ فی سطر دی جاتی تھی۔ عام فائدے کے مضمون مفت تھے۔ اس پرچے کی بعض نمایاں خصوصیات تھیں۔ مثلاً ہر ایک پرچے میں انگریزی اور دیسی ملازمین سرکار کی رخصت، تبدیلی، تقرری وغیرہ کی خبریں چھپی ہیں۔ ان میں پنجاب کے علاوہ دلی، ممالک غرب وشمال (حال یو پی) مرکزی

حکومت کلکتہ کے ملازموں کی نقل و حرکت بھی شامل ہے۔ یہ گویا پنجاب گزٹ اور گورنمنٹ گزٹ الہ آباد کا انتخاب ہوتا تھا۔

وائسرائے اور لفٹننٹ گورنروں اور کمانڈر انچیف کے دوروں کی خبریں اور ان کے درباروں کے حالات پوری تفصیل سے چھپے ہیں۔ ایک ایک دربار کی خبر اور اس میں شامل ہونے والے والیان ریاست اور رؤسا کے نام ملتے ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پر پرچے کے اپنے نامہ نگار اور خبر نویس تھے جو وہاں کی خبریں باقاعدگی سے بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے اخباروں سے — عام اردو ہوں یا انگریزی — خبریں نقل کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اس سے غالباً مفر بھی نہیں تھا۔ دوسرے اخبار بھی یہی کرتے تھے۔

ہندوستان سے باہر کے دو ملکوں کی خبریں بہت کثرت سے ملتی ہیں — افغانستان اور چین۔ افغانستان کی خبریں اور وہاں کے حکمران کے جزوی حالات تک ہر ہفتے شائع ہوتے تھے۔ خدا معلوم ان کا منبع کیا تھا!

خبروں میں تنوع ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور عام فہم بنایا جائے۔ ادبی حصّہ بہت کم ہے، بالعموم یہ دلچسپی مقامی حالات کے بیان سے پیدا کی جاتی ہے۔

ذیل میں ان پرچوں کا انتخاب مختلف عنوانات کے تحت دیا جاتا ہے۔ تمام اقتباس اصلی عبارت اور اسلوب خط میں دیے جا رہے ہیں:

(الف) حالاتِ شورش ۱۸۵۷ء: اگرچہ انگریزوں نے دلّی ستمبر ۱۸۵۷ء میں دوبارہ فتح کر لی تھی، لیکن ملک کے باقی حصّوں میں شورش اس کے بعد بھی بہت دن تک جاری رہی۔ ان اخبارات میں اس طرح کی خبریں ملتی ہیں، جن سے شورش پر قابو پانے کی رفتار اور مختلف لوگوں کی گرفتاری کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض نام ہماری دلچسپی کے بھی ہیں۔ ان کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

۱۔ بندھیل کھنڈ میں برگیڈیر وھیلر صاحب نے۔۔۔ بجگو دیں۔۔۔ محاصرہ باغیانِ بداندیشاں کرلیا ہے۔۔۔ سردار باغیان فیروز شاہ و فرزند علی و رمنت خان اور مکھن سنگھ ہیں (کوہِ نور ۸ نومبر ۱۸۵۹ء ماخوذ از لاہور کرانیکل ۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

۲۔ سیّد محمد اسمٰعیل خان معروف بہ منشی ملازم نواب باندہ بجرم بغاوت کے معرفت کوتوال فرخ آباد گرفتار ہوکر صاحب مجسٹریٹ کی خدمت میں روانہ ہوا اور وہاں سے ۳۱ اکتوبر کو بسواری بہلی معہ ایک آدمی بحراستِ سپاہیانِ سکھ کے روانہ باندہ ہوا۔ باندا میں تحقیقاتِ جرم ہوکر حکم مناسب صادر ہوگا (۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

[غالباً یہ سیّد محمد اسمٰعیل حسین خان مشہور شاعر منیر شکوہ آبادی (ف ۱۳ اگست ۱۸۸۰ء) ہیں۔]

۳۔ جناب صاحب سکریٹری ہند کی تحریر کے بموجب گورنمنٹ انگریزی سے تجویز ہوئی کہ ہر ایک احاطہ میں ایک ایک کمشنر واسطے تحقیقات مقدمات ان ایام مفسدہ کے مقرر ہووےیں۔ تحقیقات ۱۵ نومبر سے چار مہینے کے عرصہ میں ختم ہوگی اور اہل استحقاق کو معاوضہ ملیگا۔ واسطے تحقیقاتِ مقدمات پنجاب میں۔۔۔ آر ٹمپل صاحب بہادر کمشنر لاہور مقرر ہوئے۔ (۱۰ نومبر ۱۸۵۹ء)

۴۔ معلوم ہوا کہ۔۔۔۔ ۸ نومبر سنہ حال یوم سہ شنبہ وقت ۶ بجے صبح کے مستمی و زیر خان مفسد کوتوال نواب باغی فرخ آباد کو خاص فرخ آباد میں پھانسی ہوگئی، اور لاش اس کی جلائی گئی اور راکھ کھیتوں میں ڈلوائی گئی۔ (۲۲ نومبر ۱۸۵۹ء)

۵۔ محمد شاہ مفسد جو آگرہ سے آیا ہے، کلکتہ کو جاتا ہے۔ وہاں اوس کے لیے تجویز پنشن کی ہوگی اور کسی مکان میں نظر بند رہیگا (۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء)

۶۔ ایک شخص محمد دستگیر خان نامی مفسد ساکنہ لکھنؤ جو علاقہ ٹونک میں چھپا ہوا تھا اور اہالیانِ نواب صاحب بہادر والی ٹونک کی کوشش سے گرفتار ہوکر چھاؤنی دیولی میں قید تھا۔ واسطے تحقیقات کے لکھنؤ کو بھیجا گیا (دسمبر ۱۸۵۹ء)

۷۔ کل کی خبر ہے کہ والی گونڈا نے مع کچھ آدمیوں کے اپنے تئیں سپرد سرکار کر دیا۔ وہ شدت سے بیمار اور قریب المرگ ہے۔ راجہ دیوی بخش مدت ہوئی اس دنیا کو پدرود کر گیا۔ (۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۸۔ سرکار نے فضل عظیم مفسد کو جس نے ایامِ غدر میں اپنے تئیں ناظم مشہور کیا تھا، معاف کر دیا۔ کہتے ہیں کہ مسٹر براڈفٹ صاحب بہادر نے اس سے اقرار جاں بخشی کا فرمایا تھا (۲۰ دسمبر ۵۹ ۱۸ء)

۹۔ نیپال سنگھ ٹھاکر سرغنہ مفسدین بحراستِ شجاعانِ انگریزی الٰہ آباد آ دیگا اور وہاں سے نسواری مرکبِ دخانی ڈاک پہنچیگا۔ جہاں وہ حیاتِ باقی بسر کریگا۔ سرکار نے اس کے گزارہ کے واسطے ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی ہے (ایضاً)

۱۰۔ جواہرات نواب باغی فرخ آباد کے جو سنگہ کو بھیجا گیا ہے۔ کلکتہ میں لا کر نیلام کیے جاوینگے۔ (ایضاً)

۱۱۔ خان بہادر خان نمکحرام مطیع سرکار ہو گیا (ایضاً)

۱۲۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر خان نواب بریلی والہ اور ممو خان ۱۱ تاریخ دسمبر کو بحراستِ گارڈ جوانان گورکھہ مقام ٹوہان پہونچ گئے (۲۷ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۱۳۔ مقدمہ ممو خان نمکحرام کا طے ہو کر حکم اخیر کے واسطے بخدمت جناب صاحب چیف کمشنر بہادر بھیجا گیا ہے (۱۱ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۴۔ دلی میں میدان کفِ دست صاف کر دینے کا حکم ہوا ہے۔ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ یہ مقام بہت بلند نافِ شہر ہے۔ وہاں ایک توپخانہ رہیگا۔ ہماری رائے میں یہ بات غلط ہے۔ وہاں کالج رہنے کی تجویز ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں گورنمنٹ پنجاب سے بنام صاحب کمشنر بہادر دہلی حکم دیا گیا ہے (۲۷ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۱۵۔ تحقیقات مقدمۂ خان بہادر خان مفسد کی یکم فروری سے شروع ہو گی؛ چنانچہ صاحبان مندرجہ ذیل کمیشن میں مقرر ہوئے ہیں:

مسٹر روبرٹس صاحب بہادر، کمشنر، روہیل کھنڈ   پریسیڈنٹ
مسٹر دانسٹارٹ صاحب بہادر، جج، بریلی
مسٹر مشیکپیر صاحب بہادر، قائم مقام جج، مرادآباد   ممبران
مسٹر مولرس صاحب بہادر، اسسٹنٹ مجسٹریٹ، بریلی: مدعی از جانب سرکار (۱۱ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۶۔ جوجرائم ۔ منجانب سرکار ۔ ۔ ۔ بر مبراجلاس (خان بہادر خان کے خلاف) ۔ ۔ بیان کیے ہیں، حسب ذیل ہیں

(۱) باوجودیکہ وہ پنشن خوار اور بذات خود مطیع سرکار انگریزی تھا، اس نے مئی ۱۸۵۸ء تک مفسدہ کیا ۔ اور سرکار سے مقابلہ کیا اور روہیل کھنڈ میں جوعرصہ مذکور میں ہر گونہ فساد کا تھا سردار اور سرغنہ باغیوں کا بنا رہا ۔ اس کا ثبوت مراتب مندرجۂ ذیل سے ہوتا ہے:

اوّل، یہ کہ اس نے اشتہارات اس مضمون کے جاری کیے کہ میں روہیل کھنڈ کا حاکم بنا ہوں ۔

دوم، یہ کہ اس نے بداؤں و شاہجہان پور و پیلی بھیت میں ناظم مقرر کیے ۔

سوم، یہ کہ اس نے عملگان پولیس و مال مقرر کیے ۔

چہارم، یہ کہ اس نے محاصل زمین وصول کیا اور ٹیکس بھی لیا

پنجم، یہ کہ اس نے سکّہ چلایا

ششم، یہ کہ اس نے نینی تال پر حملہ کرنے اور جناب کمانڈر انچیف صاحب بہادر سے لڑنے کو فوج بھیجی ۔

(۲) خان بہادر خان ۳۱ مئی و یکم جون ۱۸۵۷ء کو قتل صاحبان مندرجۂ ذیل میں شریک تھا بلکہ وہ سردار قاتلان کا تھا اور اس نے کئی اور عیسائیوں کو قتل کردیا (اس کے بعد ۱۳ آدمیوں کے نام ہیں) (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۷ ۱۳ تاریخ (فروری) کو بریلی سے تار برقی پر خبر آئی کہ اوس دن مقدمہ

خان بہادر خاں مفسد کا طے ہو گیا۔ صاحبانِ کمیشن نے اوس کی نسبت حکم قصاص کا دیا (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۸۔ ۲۸ تاریخ جنوری کو مسٹر لنکن صاحب بہادر اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ نے روبرو ممو خان مفسد کے نواب اشرف الدولہ کو بلا کر پوچھا کہ ایامِ غدر میں ممو خان نے کوئی حکم قتل کسی صاحب انگریز بہادر کا دیا تھا یا نہیں ـــــ نواب مذکور نے جواب دیا کہ میں نے ممو خان کو ایسا حکم دیتے کبھی نہیں سُنا (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۱۹۔ خط مورخہ دوم فروری آمدہ عدن سے معلوم ہوا کہ ۲۷ جنوری کو تفضل حسین خان باغی نواب فرخ آباد عدن میں پہنچ گیا اور کل کی تاریخ صاحب انگریز بہادر محافظِ مذکور نے اس کو شمال کی جانب لے جا کر کنارہ عرب پر آزاد کر دیا، اور کہہ دیا کہ اگر کبھی ہندستان یا کسی ملک ماتحت سرکار انگریزی میں واپس آئیگا، تو جان کو خطرہ میں ڈالیگا۔ ایک ہزار روپیہ بھی نواب مذکور کو دیا گیا کہ اپنے اور اپنے خدمتگاروں کے خرچ میں لگا دے (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

[یہ فرخ آباد کے آخری حکمران نواب تفضل حسین خان ہیں، جو جانشین تھے نواب تجمل حسین (برادر بیش تجمل حسین خاں کے بیٹے) کے۔ غالب کے ایک خط میں بھی ان کا ذکر ہے۔ ۱۸۸۲ء میں حجاز ہی میں انتقال ہوا۔]

۲۰۔ مسٹر پی کارنگی صاحب بہادر نے مقدمہ ممو خان مفسد کا سپردِ عدالت جناب کرنیل ایبٹ صاحب بہادر فرمادیا۔ مجرم مذکور کی نسبت صرف یہی ثابت نہیں کہ وہ سرغنہ باغیوں کا رہا، بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ وہ قتل سر ایم جیکسن صاحب بہادر و دیگر صاحبانِ انگریز میں جن کو باغیوں نے قیصر باغ میں قید کر لیا تھا شریک تھا (۳ مارچ ۱۸۶۰ء)

۲۱۔ مقدمۂ ممو خان مفسد جو عاشق بیگم مفسدہ مشہور ہے، طے ہو گیا۔ اگرچہ عوام کی یہ رائے تھی کہ وہ مستوجب سزا قصاص ہے، مگر حکام نصفت نشان نے از رہِ ترحم اوس کی نسبت حکم جلا وطنی حینِ حیات نافذ فرمایا ہے (۱ اپریل ۱۸۶۰ء)

۲۲ سُنتے ہیں کہ جناب نائب السلطنت امیر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر نے

براہِ الطاف خسروانہ ارشاد کیا ہے کہ جامع مسجد واقع دہلی، مسلمانانِ دہلی کو واپس مل جائے۔ (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۲۳۔ خبر ہے کہ پنشن دارانِ دہلی کی نسبت یہ حکم ہوا ہے کہ جن لوگوں نے بایامِ مفسدہ شاہ دہلی کی فہرست پنشنداران میں اپنا نام لکھایا تھا، ان کو خونیش چھینے میں ملتی تھی۔ اب سال بھر میں ملے؛ اور جو آزاد اور صابر رہے ان کو پنشن مقررہ بدستور ملا کرے (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۲۴۔ کانپور: ۳ تاریخ مئی کو جوالا پرشاد باغی اس مقام پر پھانسی دیا گیا، جہاں اس سے ایامِ غدر میں افعال زشت خونریزی صاحبانِ انگریز بہادر کے سرزد ہوئے تھے۔ اس نے تادمِ زیست اپنی تقصیرات سے انکار کیا، اور جب اس سے وجہ اس کی پوچھی گئی، تو اس نے بیان کیا کہ اب سچ بولنے سے کچھ فائدہ نہیں، اور نہ تب تھا یعنی ۱۸۵۷ء میں (۱۲ مئی ۱۸۶۰ء)

[ایامِ فساد میں کانپور میں تین آدمیوں پر انگریزوں کو قتل کرنے کا الزام عائد ہوا تھا: جوالا پرشاد، اعظم اللہ اور نانا صاحب]

۲۵۔ ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۱۳ جون میں لکھتے ہیں کہ پہلے یہ تجویز تھی کہ جامع مسجد بدستور مسلمانوں کو دی جائے مگر اب جناب سر رو برٹ مانٹ گمری صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر پنجاب نے فیصلہ کیا ہے کہ جامع مسجد ملکیت شاہ دہلی کی تھی اور مثل اور اسباب شاہ دہلی کے سرکار نے اس کو ضبط کیا تھا پس وہ سرکار کی ملکیت ہے اور مسلمانوں کو واپس نہ ملنی چاہیے۔ سوائے اس مسجد کے اور مساجد مسلمانوں کو واپس دی گئی ہیں۔ جامع مسجد میں اسباب جنگی رہا کرے گا (۲۳ جون ۱۸۶۰ء)

۲۶۔ مفید الانام میں لکھا دیکھا کہ جامع مسجد و دریبہ کے نواح میں پیمائش مکانات کی ہو گی۔ کچھ مکانات خزانچیوں کے اور دو کانیں دریبہ کی باقی رہیں، باقی جملہ مکانات کو چنڑ چوہدری تک گرا دیے جاویں گے۔ خونی دروازہ کے سامنے

سے چار چار سو فٹ تک میدان ہو گا (۲۴ اگست ۱۸۶۰ء)

۲۷۔ میرزا الٰہی بخش شاہزادہ شاہِ معزول دہلی خیر خواہ سرکار کے حق میں یہ حکم ہوا ہے کہ ایام غدر کی بابت سب تنخواہ دی جائے اور آیندہ قریب دو ہزار دو سو روپے ماہواری ملا کرے (ایضاً)

۲۸۔ اخبار ہرکارہ سے معلوم ہوا کہ قیدیانِ شاہی مقیم رنگون یعنی شاہ دہلی اور اس کے ہمراہیوں کا ماہوار یافتہ ۶۔ آنہ ۷۔ ۶۳۱ روپیہ ہر ماہ اور علاوہ اس کے دو سو ماہوار اس افسر کو ملتا ہے، جو ان کا مہتمم ہے (۲۵ اگست ۱۸۶۰ء)

۲۹۔ خطوط آمدۂ دہلی سے واضح ہوا کہ ان دنوں سرکار فیض مدار انگریزی نے مرزا الٰہی بخش کو بجلدوے اس کے کہ اوس نے گرفتاری شاہ دہلی میں مدد دی تھی ایک لاکھ روپیہ مرحمت کیا ہے اور کچھ تنخواہ ماہوار بھی مقرر کی ہے مرزا مذکور خسر مرزا فخر الدین ولی عہد کا ہے جو کچھ مہینہ پیشتر مفسدہ کے راہیِ عالم بقا ہوا تھا (یکم ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۰۔ از روے خطِ خانگی آمدۂ نیپال دہلی گوٹ میں درج ہے کہ کچھ سپاہیانِ مفسد الشوالہ پشپ پت ناتھ (پشپوپتی ناتھ) نیپال میں جمع ہوئے تھے اور اپنے تئیں برہمن اور معتقد شو کا ظاہر کیا تھا۔ مہاراجہ جنگ بہادر نے خبر پاکر ان کو وہاں سے نکال دیا (۸ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۱۔ بیگم مفسدہ مع اپنے بیٹے برجیس قدر کے و بالا راؤ و دیگر سرغنہ مفسدین پہاڑ دل میں اپنے رہنے کے واسطے مکانات بنا رہے ہیں۔ اکثر ہمراہی ان کے بباعثِ دبا بعضہ ان سے علیحدہ ہو گئے ہیں (ایضاً)

۳۲۔ تخت شاہِ سابق دہلی جو دہلی سے کلکتہ کو بھیجا گیا تھا، مرکبِ دخانی "اسلیڈن" نام پر انگلینڈ کو بھیجا گیا (۱۵ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۳۔ جامع مسجد دہلی کی نسبت سابق حکم واگذار ہو گیا تھا، مگر بسببِ نزاع باہم فرقہ، دہابی و فریق ثانی اہلِ اسلام کے بدخلی رہ کر حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر

سے حکمِ ضبطی بدستورِ سابق نافذ ہوا تھا۔ اب پیشگاہِ نواب مستطاب گورنر جنرل بہادر سے پھر حکم واگذاشت اوس کا نافذ ہوا ہے اور قبل از دخل مسلمانانِ دہلی کو حکم ہوا ہے کہ اوّل تم آپس کا نزاع رفع کر کے فہرست اون رئیسوں کی پیش کرو، جو حامی ہر نوع انتظامِ مسجدِ مذکور کے ہونگے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ایک فتویٰ علمایانِ دین کا مرتب کر کے مع تفصیل اون عقائد کے پیش کیا ہے جو قبل از غدر منعقد تھے، اور جواب قائم رہینگے۔ فتویٰ حسبِ ذیل ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمایانِ دین اس صورت میں کہ جامع مسجد مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گئی تھی اب حاکمانِ وقت نے کہ کسی کے دین اور مذہب سے اون کو مزاحمت اور تعرض نہیں اور نہ پہلے تھا، اور نماز و اذان اور اقامتِ جمع و اعیاد و شعائرِ اہلِ اسلام علی الاعلان اون کے عہد میں بخوبی جاری تھے، اور جاری ہیں، از راہِ نصفت و عدالت کے حکم دیا کہ اہلِ اسلام بدستورِ سابق جامع مسجد میں نماز پڑھا کریں۔ مگر بعض مسلمان یہ کہتے ہیں کہ تبرکات منسوبہ حضرت سیدِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی بدستورِ سابق رکھے جاویں، اور صورت درگاہ کی قرار پاوے۔ اور اکثر اہلِ اسلام مانع اس امر کے ہیں اور حکام کی طرف سے تاکید ہے کہ آپس میں سب مسلمان اتفاق کر کر مسجد اپنے تصرف میں لاویں، سوا اِلّا مسجد نہ ملیگی۔ پس یہ عذر تبرکات کے نہ رکھنے کا جو جانب بعضے اسلام سے ہے، حال میں اور اوس وقت میں ٹھیک ہے یا نہیں؟

جواب: یہ عذر ٹھیک نہیں اور خلافِ مصلحتِ وقت ہے۔ اوّل، تبرکات باسنادِ صحیحہ کہاں؟ بلکہ بیشتر وضعی ہیں، اور وہ وضع بھی اب نہیں ہی وضع ثانی ہے۔ دوسرے، یہ کہ مسجد واسطے فرائض اور مکتوبات کے ہے، نہ واسطے

زیارت تبرکات کے گو باسنادِ ضعیفہ ثابت ہی ہو جاویں بلکہ اکابر اہل اسلام سنن و نوافل بھی مسجد میں ادا کرتے تھے، اپنے گھر میں پڑھتے تھے۔

تیسرے، یہ کہ اس وقت میں ایسی تکرار باہم نہ چاہیے، بلکہ تمام اہل قبلہ کو چاہیے کہ آپس میں اتفاق کریں اور متفق علیہ کو اختیار کریں مختلف فیہ کو چھوڑ دیں۔

چوتھے، یہ کہ ایک امر زائد کی تکرار سے مقصود اصلی و مہتم بالشان یعنی صلوٰۃ او ر امامت و جماعت کو چھوڑ دینا خلاف دینداری ہے اور بموجب فساد کہ اس نزاع و تکرار مذہبی میں مسجد بجز مسلمانوں کو نہ ملیگی اور ہمیشہ کفِ افسوس ملتے رہینگے:

محمد صدر الدین سابق صدر الصدور	مولوی محمد قطب الدین
محمد نقی خان	سید محبوب علی جعفری
فقیر خواجہ ضیاء الدین احمد	سید محمد نذیر حسین
محمد عبد القادر	محمد رحمت اللہ
محمد یوسف	محمد اسمٰعیل

تفصیل اون صاحبوں کی جو اہتمام مسجد کے واسطے رضامند ہوئے، جن کی طرف سے درخواست وگذاشت کی ہے:

۱۔ صاحب عالم مرزا الٰہی بخش صاحب شہزادہ خیر خواہ؛ ۲۔ مولوی محمد صدر الدین صاحب؛ ۳۔ سید محی الدین خان بہادر؛ ۴۔ مرزا اسفند یار بیگ صاحب؛ ۵۔ سید احمد علی صاحب؛ ۶ امام مسجد جامع داؤد خان صاحب؛ ۷۔ حاجی قطب الدین صاحب؛ ۸۔ معمور بخش صاحب سوداگر، ۹۔ شیخ برکت اللہ صاحب؛ ۱۰ منشی تراب علی صاحب

تفصیل عقاید و دستور جامع مسجد کا زبانی سید احمد علی صاحب امام مسجد تا تمام تاریخ فرقی۔

دفعہ ۱۔ مسجد میں اذان، نماز، خطبہ ہوتا تھا۔ بعد نماز جمعہ کے مسائل روزہ نماز کے کوئی کوئی مولوی ہمیشہ واسطے ثواب کے بیان کرتے تھے

دفعہ ۲۔ حجروں میں حافظ جو لڑکوں کو کلام اللہ پڑھاتے رہتے تھے، اور بعض درویش متوکل بھی رہتے تھے

دفعہ ۳۔ رات کو ایک پہر پر دو گھڑی بجے جامع مسجد کی سنبھال ہوتی تھی، غیر آدمی سوائے معمولی رہنے والوں کے نہ رہنے پاوے تھا، اجنبی کو باہر کر دیتے تھے، الا ماہ رمضان میں اکثر اور لوگ معتمد بھی رات کو رہتے تھے، واسطے اعتکاف اور ختم کلام اللہ کے۔

دفعہ ۴۔ ایک پہر رہے پر دو گھڑی رات گئے کیواڑ بند ہوتے تھے اور چار گھڑی رات رہے کھلتے تھے۔

دفعہ ۵۔ آثار شریف میں پانچوں وقت بعد ہر نماز کے صلوٰۃ پڑھی جاتی تھی اور پنجشنبہ کو ختم ہوتا تھا اور مدح خوانی اور کچھ شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور جمعہ کو بعد نماز کے صلوٰۃ پڑھ کر بعضے تبرکات کی زیارت ہوتی تھی اور محرم و ربیع الاول اور جمعہ وداع کو زیارت تبرکات کی ہوتی تھی۔

دفعہ ۶۔ جو نذر نیاز مسجد میں چڑھتی (چڑھتی) تھی اسس میں خادمانِ آثار شریف شریک نہیں تھے اور جو آثار شریف میں چڑھتی (چڑھتی) تھی، اس میں خادمانِ مسجد شریک نہ تھے۔

دفعہ ۷۔ جو راجہ بابو آیا چاہتے تھے تو قلعہ دار صاحب کا حکم پہلے آتا تھا۔

دفعہ ۸۔ جو صاحبانِ انگریز بہادر مسجد میں آتے تھے، جن کے موزہ صاف ہوتے تھے، وہ مع موزہ چلے جاتے تھے جن کے موزہ ناپاک ہوتے تھے، وہ اتار کر آتے تھے۔

دفعہ ۹۔ گوروں کے آنے کی ممانعت تھی۔

[گوروں سے یہاں مراد انگریز فوجی ہیں]

دفعہ ۱۰۔ آثار شریف میں جالیوں کے اندر حکام یا انگریز موزہ پہنے نہیں جاتے تھے جن کو جانا منظور ہوتا تھا۔ موزہ اتار کر جاتے تھے۔

دفعہ ۱۱۔ جو صاحب واسطے سیر مینار کے آتے تھے، پہلے صاحب قلعہ دار اوس کا حکم بھواتے تھے اور داروغہ مسجد ساتھ ہو کر سیر کراتا تھا
دفعہ ۱۲۔ ہنود مسجد میں نہیں جاتے تھے۔
دفعہ ۱۳۔ جس صاحب کی خوشی ہوتی تھی، خادمان مسجد کو انعام دیتے تھے۔
دفعہ ۱۴۔ نواب گورنر جنرل جب تشریف لاتے تھے، پانچ سو روپیہ انعام دیتے تھے۔ اوس میں خادمان آثار شریف اور درویشان وطالب علمان ساکن مسجد کو شرکت تھی۔
دفعہ ۱۵۔ سو روپیہ سالیانہ سرکار سے آثار شریف کی نیاز مقرر تھی
دفعہ ۱۶۔ آمدنی تہ بازاری وکرایہ دکاکین تخمیناً تین سو روپیہ سے زیادہ تھی، اوس میں خرچ ہوتا تھا۔
دفعہ ۱۷۔ دو گھڑیال اور ایک نقارہ رہتا تھا۔ فقط

تفصیل اون عقاید کی جو حال کے واسطے درخواست میں پیش ہوئے:

دفعہ ۱۔ تین پہرہ تینوں دروازۂ جامع مسجد پر سرکار کی طرف سے معین ہوں اور اون کو ہدایت ہو کہ بموجب ہدایت مہتمان کے کاربند رہیں۔
دفعہ ۲۔ تھانہ دار اوس علاقہ کو معاونت مہتمان کا حکم دیا جاوے
دفعہ ۳۔ محکمۂ مختشمہ کمشنری سے تینوں دروازہ پر دستور العمل انگریزی بموجب عقائد سابق لگایا جاوے
دفعہ ۴۔ بموجب دستور کے مرمت شکست ریخت مسجد کی سرکار سے ہوا کرے
دفعہ ۵۔ مسجد میں سوائے خدام اور معلم اور کوئی اجنبی نہیں رہنے پاوے گا
دفعہ ۶۔ لوگ نماز و وظیفہ، ختم وغیرہ پڑھ کر چلے جایا کرینگے۔
دفعہ ۷۔ تہ بازاری وکرایۂ دکاکین متعلقہ مسجد متعلق ہو جاویں
دفعہ ۸۔ گھڑیال اور نقارہ رکھنے کی اجازت ہو۔
دفعہ ۹۔ اگر کوئی مسجد میں دنگہ کریگا یا ارادہ یا مشورہ دنگہ فساد کا کریگا، اوس کا بندوبست کر دینگے۔ اگر ہم سے بندوبست اوس کا نہو گا، تو سرکار میں اطلاع کرینگے۔

دفعہ ۱۱۔ جو اخراجات ماہواری اور مرمت قلیل ہوگی، اوس کا بند و بست ہم مہتمان کے ذمّہ ہوگا کہ باعانت دیگر مسلمانان کے بند و بست کیا کرینگے۔

(۲۹ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۴۔ خطوط آمدۂ نیپال سے معلوم ہوا کہ بالا راؤ مفسد نے نانا مجرم بٹھور والا کے شراد ھ میں عسہ ہزار روپیا خرچ کیا ہے۔
بیگم مفسدہ حضرت محل کو سانپ نے کاٹا تھا، اور اب تندرست ہے۔
سنتے ہیں کہ اب نیپال میں صرف وہ مفسد باقی رہ گئے ہیں، بہت سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور بہت مفسد ہیضہ سے انتقال کر گئے۔ منجملہ ہمراہیانِ نانا مجرم صرف ۰۰ آدمی ہیں، جن میں بالا راؤ بھی ہے۔
دربار نیپال کو لکھا گیا ہے کہ وے بالا راؤ و برجیس قدر و بیگم مفسدہ حضرت محل کو بشرطیکہ وہ ممالک محروسۂ سرکار انگریزی میں نوعے خلل انداز نہ ہوں، پناہ دیں (۲۹ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۳۵۔ سابق رانی جھانسی کا دیوان مفسد مطیع سرکار انگریزی ہوکر صاحب پولیٹیکل اجنٹ بہادر گوالیار کے پاس آگیا ہے (ایضاً)

۳۶۔ خبر ہے کہ نواب مفسد فرخ آباد عدن سے مع چار آدمیوں کے لباس فقیرانہ کر کے مدینہ کی زیارت کو گیا ہے۔ نواب مذکور کے بال بچوں کے گذارہ کی تجویز سرکار میں پیش ہے (ایضاً)

۳۷۔ ۱۹ اکتوبر (۱۸۶۰ء) کو پیشگاہ حکّام نظامت عدالت آگرہ سے ولایت حسین خان مفسد شیر نواب سابق باندا کی نسبت حکم قید بامشقت ۱۴ سال مع جلا وطنی دریائے شور نافذ ہوگیا ہے۔ وارنٹ مجرم مذکور کو سنایا گیا ہے، اور آج کل میں کلکتہ کو بھیجا جاوےگا (۱۷ نومبر ۱۸۶۰ء)

[بعد کو ۱۵ دسمبر ۱۸۶۰ء کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ قید صرف چار سال ہوئی تھی]

(ب) بعض تاریخی شخصیتیں :

بعض خبریں ایسی بھی ملتی ہیں، جن سے تاریخی شخصیتوں سے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے یا ان خبروں کے بارے میں جو پہلے سے ہمارے علم میں ہیں، نئی تفصیلات ملتی ہیں :

۱۔ اخبار ہرکارہ سے دریافت ہوا کہ پنشن ۱۲ لاکھ روپیہ شاہ اودھ کو اُس تاریخ سے منظور کی گئی ہے۔ جب کہ اوس نے پیشکش سرکار انگریزی کو منظور کیا، اور نہ اوس تاریخ سے جب ملک اودھ قبضۂ اقتدار میں آیا۔ بدیں وجہ گزشتہ تین لاکھ چوہتر ہزار روپیہ بقایا پنشن شاہ اودھ کو ادا کیا گیا (۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء)

۲۔ اعیان سلطانی ولایت نے حضرت شاہ اودھ کے حق میں یہ بات تفصیل کی ہے کہ شاہ موصوف کی جاگیر میں جو بارہ لاکھ سالیانہ ہے، تین لاکھ روپیہ اور اضافہ کیا جائے۔ یعنی ۱۵ لاکھ روپیہ سالیانہ ملا کرے (ایضاً)

۳۔ حسب تجویز جناب نواب گورنر جنرل بہادر راجہ جیکشن داس رئیس ہاتھرس کو بجلدوئے خدمات عمدہ بابت ایام غدر کے خطاب راجہ بہادر کا عطا کیا گیا (۱۸ فروری ۱۸۶۰ء)

۴۔ مسٹر ایل کوان صاحب بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ لیہ، گورگانوہ کو تبدیل ہوئے۔ (۳ مارچ ۱۸۶۰ء) ستمبر میں انھوں نے دو مہینہ کی رخصت لی اور ان کی جگہ مسٹر دی فٹز پٹرک اسسٹنٹ کمشنر دہلی مقرر ہوئے (۱۵ ستمبر ۱۸۶۰ء)

۵۔ جناب مسٹر چارلس بے سانڈرس صاحب بہادر کمشنر قسمت دہلی و قائم مقام کمشنر قسمت راولپنڈی کو گورنمنٹ نے عہدۂ جلیلہ فائنشل جوڈیشل کمشنر اضلاع محروسہ حیدرآباد پر مقرر فرمایا ہے (۲۴ مارچ ۱۸۶۰ء)

۶۔ مسٹر جے، ایل۔ کوان صاحب بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کو چارج خزانہ ضلع گورگانو کا تفویض ہوا (۲۱ اپریل ۱۸۶۰ء)

[جب یہ گوڑگاواں سے تبدیل ہوئے تو اہل شہر نے ان کی خدمت میں ایک قلمدان پیش کیا۔

اس پر لکھنے کو غالب نے مندرجہ ذیل قطعہ ماسٹر پیارے لال آشوب کی فرمائش پر کہا تھا:

گوڑگاویں کی ہے جتنی رعیت، وہ یک قلم — عاشق ہے اپنے حاکم عادل کے نام کی

سو یہ نظر فروز قلمدان نذر ہے — مسٹر کووان صاحب عالی مقام کی

[خم خانہ جاوید (۱): ۱۸]

۷۔ لفٹنٹ ہالرائیڈ صاحب بہادر انسپکٹر مدارس حلقہ انبالہ کو ۶ مہینہ کی رخصت ولایت جانے کے واسطے دی گئی اور مسٹر آر سنیر صاحب بہادر قائم مقام اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سرسہ ان کی جگہ قائم مقام انسپکٹر مدارس حلقہ انبالہ مقرر ہوئے (۵ مئی ۱۸۶۰)

۸۔ اخبار انگلش مین میں درج ہے کہ ۱۸ اپریل ۱۸۶۰ء کو شاہ اودھ کے مکانات واقع گارڈن ریچ کلکتہ میں آگ لگی اور بہت سامال و اسباب جل کر سیاہ ہوگیا سنتے ہیں کہ جو جواہرات تھوڑا ہی عرصہ گزرا، سرکار سے ان کو واپس ملے تھے، وہ بھی جل کر خاک ہوگئے اور نقصان قریب ۵ لاکھ روپیہ کا ہوا ہے۔ بیگم خاص محل اپنے بیٹے حامد علی بہادر کی سعی سے جاں بسلامت رہی۔ کہتے ہیں کہ کسی نے آگ بجھانے میں کوشش نہ کی اور جس وقت اہالی پولس آئے سب اسباب برباد ہو چکا تھا (۵ مئی ۱۸۶۰)

۹۔ حضرت شاہِ اودھ کے خیامِ دولت میں ایسی آگ لگی کہ تین چار کروڑ روپے کا مال و متاع خاکستر ہوا۔ محلاتِ سلطانی میں کسی کے پاس زیور کے نام پونت کا چھلا بھی نہ رہا ۔ ۔ ۔ اگرچہ حضرت کو کچھ تردد نہیں، مگر بیگمات بالکل تہی دست ہوگئیں۔ اب شاہِ جمجاہ کے ذمہ آٹھ دس لاکھ روپے سوداگروں کے قرض ہوگئے ہیں۔ اب اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ بعد اس صدمۂ عظیم کے حضور ممدوح میں ایک بنارسی فاحشہ پہنچی، اپنا عشق جتایا، حضرت نے ارشاد کیا کہ اب تو میرے پاس کچھ دینے کو نہیں رہا۔ خوشامدی لوگ درمیان میں پڑے۔ عرض کی کہ جہاں پناہ، اس کو خواہشِ زر نہیں، صرف سرفرازی کی تمنا ہے، تا آنکہ مقبول ہوئی، سرفرازی پائی اور حضرت اس کی طرف ایسے متوجہ ہوئے کہ قرض

دام سے پچاس ہزار روپے کا زیور بنوادیا اور ادہیرانی خطاب عطا کیا۔
(۲۳. جون ۱۸۶۰ء)

۱۰۔ ایک عنایت فرما تحریر فرماتے ہیں کہ بادشاہِ اودھ بخیریت و تندرست ہیں۔ ۹ لاکھ کا قرض اور دیگر سب جو تبغافل اہالیان کے تھا، اب ادا ہوگا، اس لیے کہ شاہ ممدوح نے قریب ۴ لاکھ کے عمدہ جواہرات و تحفہ اسباب معرفت ہملٹن صاحب سوداگر کے نیلام کرا یا ہے جس میں مالاے مروارید کلاں اور حقہ مرصع جواہرات بیش بہا اور ایک الماس ۴۸ رتی کا تھا۔ باقی علیٰ ہذا اور خبر سے اب علاوہ اُن محلات اور بیگمات لکھنو کے جن میں سے کچھ خارج اور طلاق یاب بھی ہوگئیں ہیں مع محلات جدید بنگالیوں کے ۱۰۳ ہیں۔ اللھم زد فزد و ثم زدو لا تنقص
(۶ اکتوبر ۱۸۶۰ء)

۱۱۔ بادشاہ اودھ چین کرتے ہیں، شب و روز بے غل وغش گذرا نتے ہیں، بطن مبارک نواب معشوق محل سے ورین ولا فرزند ارجمند تولد ہوا، جلسوں کی دھوم دھام ہے۔ مبارک سلامت کا اثر دہام ہے (۳ نومبر ۱۸۶۰ء)

۱۲۔ (واجد علی شاہ کو سوا لاکھ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اس میں سے) دس ہزار روپے ماہواری قرض میں مجرا ہوتے ہیں کہ سرکار نے ولی عہد بہادر کو مقام لندن میں دیا تھا۔ باقی نوے ہزار سے تین ہزار چھ سو انکم ٹیکس کی بابت حسب ضابطہ منہا کیے جاتے ہیں۔ (یکم دسمبر ۱۸۶۰ء)

۱۳۔ اخبارات انگریزی سے معلوم ہوا کہ ان دنوں مولوی مسیح الدین خان صاحب متوطن کاکوری ۔۔۔ نے کہ شاہ اودھ کی طرف سے وکیل ہو کر لندن کو گئے تھے کسی صاحب انگریز کی دختر نیک اختر سے شادی کرلی اور وہ اوقات عزیز خاص لندن میں بعیش و عشرت بسر کرتے ہیں (یکم دسمبر ۱۸۶۰ء)

ج۔ ادبی خبریں: اگرچہ اس زمانے کے ان ہفتہ وار اخباروں کا مقصد در اصل

جلب زر ہوتا تھا یا سرکار دولت مدار کی مدح سرائی، لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار کچھ ادبی نوعیت کی چیزیں بھی ان میں چھپ جاتی تھیں۔

۱۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء کے پرچے میں ۲۰ شعر کا طویل قصیدہ مہاراجہ جموں وکشمیر کی مدح میں محمد مردان علی خان مراد آبادی کے قلم سے چھپا ہے، اس میں تخلص رعنا لکھا ہے۔

[محمد مردان علی خان رعنا نے بعد کو تخلص نظام کر لیا تھا۔ غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے حالات تلامذۂ غالب میں دیکھے جا سکتے ہیں]

۲۔ انتخاب گورنمنٹ گزٹ الہ آباد ۲۲ مارچ ۱۸۶۰ء ۔سرکلر نمبر ۱۶ (صاحبان جج اضلاع ملک غربی مکتوب الیہم) ۲۲ مارچ ۱۸۶۰ء حکام صدر کو نسبت طریقہ تحریر فیصلہ جات حاکمان ہندوستانی ماتحت کے اکثر محل شکایت ہوا کرتا ہے، کس واسطے کہ اولاً فیصلہ جات مذکور بیشتر بعبارت طویل والفاظی فضول تحریر ہوتے ہیں اور ثانیاً ان میں خصوصاً ایسے الفاظ عربی جو زبان اردو کے روزمرہ میں مستعمل نہیں اور جن کو سوائے شخص عربی دان کے کوئی کم سمجھتا ہے، کثرت سے آتے ہیں (۲۸ اپریل ۱۸۶۰ء)

[خود اس خبر کی عبارت آرائی قابل داد ہے]

۳۔ مہاراجہ کپورتھلہ اور ان کے چھوٹے بھائی کنور سوچیت سنگھ کے مابین کچھ تنازع ہوا تھا اور بامداد سرکار کنور صاحب کو علاقہ بنگہ کا عوض ایک لاکھ روپے کے علاقہ کپورتھلہ سے علٰحدہ مل گیا تھا ۔۔۔۔ اب حسب تحریک جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دونوں بھائیوں میں باہم اتفاق ہو گیا۔۔ یہ موقع نہایت خوشی اور کمال مبارکبادی کا تھا، جناب مرزا افتخار صاحب شاعر بیعدیل سیستانی نے قطعۂ تاریخ مصالحت کا موزوں فرمایا۔ (اس کے بعد ۳۱ شعر کا فارسی قطعۂ تاریخ مصالحت درج ہے) (۲۸ اپریل ۱۸۶۰ء)

[بہ خاور، میرزا محمد اکبر خان قزلباش سیستانی بھی غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے حالات بھی تلامذۂ غالب میں شامل ہیں]

۴۔ ہورس ہمن ولسن صاحب مدرس سنسکرت کالج آکسفورڈ و داروغۂ کتب خانۂ سرکار دولتمدار حضرت ملکہ معظمہ۔۔۔ نے بعمر ۵۵ سالگی ۸ مئی ۱۸۶۰ء کو۔۔۔ رحلت فرمائی۔۔۔۔شاعر شیریں زبان۔۔ منشی سید عبداللہ۔۔مدرس یونیورسٹی کالج، لندن (کی دو فارسی تاریخیں درج ہیں) پہلی کی تاریخ ہے:

سید ا، تاریخش از روئے بکا ہورس ہمن ولسن مغفور ہیں

اور دوسری تاریخ ہے:

سید برائے سالِ وفاتش بصد الم گفتا زمرگِ ولسن داغ قلوب شد

(۲۹ ستمبر ۱۸۶۰ء)

د۔ معاصر تصنیفات:

کوہ نور کے زیرِ نظر پرچوں میں بعض کتابوں سے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کتاب کا اشتہار ہے، یا کسی صاحب کی کتاب کی تفصیل ہے جو صاحب مطبع کا دوست معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض کے کوائف دیے جاتے ہیں:

۱۔ سفر نامہ منشی امین چند ۲ حصّہ: قیمت تین روپیہ

یہ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر راولپنڈی تھے؛ پہلی جلد آگرے میں چھپی اور لکھا ہے کہ "مدارس سرکاری میں بھی داخل رہی تھی" دوسری جلد کوہ نور میں چھپی پہلے حصّے میں پنجاب، کشمیر، سندھ اور دوسرے برخے از ملک دکن و خاندیس و مالوہ و راجپوتانہ کا ذکر ہے، دوسرے میں اضلاعِ ممالک مغربی و شمالی، اودھ مع عجائبات و نوادر ممالکِ مذکورہ و اضلاعِ بنگال و نواح کلکتہ و جگناتھ پوری وغیرہ (۲۲ نومبر ۱۸۵۹ء)

۲۔ اشتہار منتخبات جدیدہ یعنی نسخۂ آئین و ضوابطِ فوجداری مرتبہ تا ۱۸۵۹ء از منشی

مہدی علی۔۔جسے صاحب سررشتہ دار کلکٹری ضلع اٹاوہ نے۔۔مرتب کیا۔ مطبع نولکشور کی صحت اور خوشخطی اور عمدگی چھاپہ۔۔۔بحساب پانچ روپیہ پیشگی۔۔۔ورنہ بعد اختتام سات روپے لیے جاوینگے۔(۱۰ مارچ ۱۸۶۰ء)

[یہی منشی مہدی علی بعد کے نواب محسن الملک ہیں]۔

۳۔ دیوان تفتہ جلد دوم از منشی ہرگوپال صاحب سکندرآبادی قیمت ۳ روپیہ (۷ اپریل ۱۸۶۰ء)

۴۔ تضمین گلستان تصنیف تفتہ صاحب قیمت ۱۲ آنہ (ایضاً)

۵۔ جناب تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں متخلص بہ آسیر۔۔۔میاں مصحفی کے شاگرد رشید۔۔۔مقرب بارگاہ سلطان رہے۔۔بیکڑوں شاگرد ہیں، فارسی اردو میں صاحب دیوان و قصیدہ و مثنوی نہایت خوش بیان۔دو دیوان ان کے کاغذ فرنج فلس ولایتی پر بخط عمدہ ایک جلد میں ہیتیس جزدایک حاشیہ پر، ایک متن میں چھپے ہوئے۔۔۔دو روپیہ فی جلد۔۔پچیس جلد لو نے دو روپیہ اور پچاس جلد کے۔۔عہ فی جلد مقرر ہے اور سو جلد کے خریدار کے سوا روپیہ فی جلد (اشتہار از مینیجر مطبع اودھ گزٹ، لکھنؤ (۱۹ مئی ۱۸۶۰ء)

۶۔ اشتہار: جلد دوم دیوان سحر المقال سرآمد شعرائے حال جناب منشی ہرگوپال تفتہ شاگرد رشید فاضل دہر علامۃ العصر جناب مرزا اسد اللہ خان صاحب متخلص بہ غالب۔۔عرصہ سے اس مطبع میں تیار ہے۔جو صاحب اس کی پچاس جلدیں خرید ینگے، سوا سو روپے کو۔۔دے دینگے اور سو جلد دو سو کو، دس پانچ یا ایک دو۔۔فی جلد تین روپے کو۔۔۔زرِ نقد مہتمم کوہ نور کے پاس بھیج کر منگالیں۔(۹ جون ۱۸۶۰ء)

۷۔ اسی پرچے میں مرزا حاتم علی مہر کی ایک کتاب کا اشتہار ہے:

رسالہ قاعدۂ نغمہ۔۔۔تالیف مرزا حاتم علی مہر۔۔کمال کیا ہے صرف نقشوں کی ترتیب میں تمام راگوں اور راگنیوں اور ان کے پتروں اور بھاویاؤں اور

سُروں کو ایسی اچھی ترتیب سے مرتب کیا ہے کہ تھوڑے سے تردد میں اس علم کے شائق کو تمیزِ اوقاتِ راگ اور سُروں اور سنکیرنوں کی ہو جاتی ہے۔ قیمت معہ محصول ۳ر (۹ جون ۱۸۶۰ء)

۸۔ کتاب لاجواب مسمیٰ مہابھارت جو زبان سنسکرت سے زبانِ فارسی میں جناب شیخ ابوالفیض فیضی صاحب نے ترجمہ کیا، الحال یہاں لکھنؤ میں جناب منشی طوطا رام نے اس کو زبانِ اُردو میں نظم کیا ہے، عرصہ چھ برس میں ... دس ہزار شعر ہیں۔ جس وقت ایک سو درخواست آچکے، اس وقت کتاب کا چھاپنا شروع ہو۔ خریداران درخواست اپنی ... اور دو روپیہ قیمت پیشگی ... عنایت فرمائیں۔ اشتہار از مطبع اودھ گزٹ لکھنؤ (۷ جولائی ۱۸۶۰ء)

۹۔ گورو مادھو سنگھ کرتارپور والہ نے ایک گرنتھ صحیح اور عہدِ قدیم کا لکھا ہوا کتب خانہ انڈیا ہوس کے واسطے سرکار میں پیشکش کیا تھا، اس کے صلے میں اس کو خلعت پندرہ سو روپیہ مع ایک سند خوشنودی مرحمت ہوئی۔ اور بیدی بکرمان سنگھ امرت سر والہ نے جنم ساکھی مشرح اور صحیح باباناں نک کی سرکار میں پیشکش کی تھی؛ اس کو خلعت پانسو روپیہ مع ایک سندِ خوشنودی بوجہ انعام عطا ہوئی — (یکم ستمبر ۱۸۶۰ء)

۱۰۔ اشتہار: چیز چندر کا مؤلفہ مہاراجہ بلونت سنگھ بہادر کاشی نریش در صنائع و بدائع مطبع ہندی قیمت مع محصول ۲ روپیہ ۸ر

[مہاراجہ بلونت سنگھ سے غالباً مہاراجہ بلوان سنگھ مراد ہیں، جو بیٹے تھے مہاراجہ چیت سنگھ والیِ بنارس کے ان کا اُردو میں راجہ تخلص تھا۔ ان کا دیوان موجود ہے]

۱۱۔ اشتہار، کتاب تاریخ اودھ جس میں تمام جغرافیہ ملک اودھ اور کل حال مفصل از عہد نواب سعادت علی خان تا زمانِ واجد علی شاہ ... مع سبب ضبطیِ ملک اودھ از منشی تہمت پرشاد ۸ر قیمت اس مطبع میں بھیج کر ... طلب فرماویں۔ کتاب

تخمیناً چھ جز دیر ہوگی (۲۹ دسمبر ۱۸۶۰ء)

(۷) عام دلچسپی کی خبروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ایسی خبروں سے ان اقدامات کا پتا چلتا ہے جو انگریزی حکومت نے یہاں کے نظم و نسق اور اپنے تسلط کے استحکام سے متعلق کیے۔

۱۔ سڑک آہنی لکھنؤ مارچ ۱۸۶۰ء میں شروع ہو جاوگی (۱۰ نومبر ۱۸۵۹ء)

۲۔ اقتضائے ملاءِ اعلیٰ سلطانی دربیِ ولایوں قرار پایا کہ زمینداران زراعت پیشہ تو اپنے محاصلاتِ زراعت میں سرکار کو حسب جمعبندی و مشخصہ معمولی زرِ واجب ادا کرتے ہیں، مگر دیگر پیشہ وران مثل تجاران و ساہوکاران و نوکران وغیرہ اپنے ماحصل میں سے کچھ نہیں دیتے، پس انصاف سے بعید ہے کہ ایک گروہ کے ماحصل سے سرکار اپنا حق مالکانہ و خسروانہ وصول کرے، اور دوسرا تیسرا فریق مرفوع القلم رہے۔ چنانچہ ولایت میں کوئی پیشہ ور۔ ۔ اس دین سے بری نہیں ہے، پانچ روپے سیکڑہ سے سات روپے سیکڑہ تک ہر پیشہ ور نوکر چاکر اپنے منافع سالیانہ سے بطریق شکرانۂ امن چین مملکت کے سرکار کو نذر کرتا ہے۔ معہذا ماہ گزشتہ میں یہ حکم صادر ہوا تھا کہ محاصل مذکورۂ بالا جس کا نام ٹکس ہے مثل انگلستان، ہندستان میں بھی سب پیشہ وروں و سوداگروں و نوکروں چاکروں سے لیا جاوے۔ ۔ ۔ اور علیٰ قدر مراتبِ آمدنی و محاصل ہر واحد سے (۳ روپیہ) سیکڑہ کے حساب سے لیا جاوے اور بموجب زرِ ٹکس پیشہ ور کے نمبر مقرر کیے جاویں اور جس نمبر پر جو شخص بموجب تشخیصِ منافع خود قائم ہو، زرِ واجبی سال بسال سرکار کو دیا کرے۔ (۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

۳۔ روبکاری عدالت فوجداری ضلع لاہور: ۳ نومبر ۱۸۵۹ء

"حکم تھانہ داروں اور کوتوال لاہور کو دیا گیا تھا کہ طوائف شہر اور انارکلی کے جو پیشہ کرتی ہے، وہ اندر گھر کے بیٹھا کریں اور دروازوں پر چق ڈالا کریں، کسی وقت چق نہ اٹھاویں اور چنداں بازار میں نہ ٹھہرا کریں۔ اس حکم کی کچھ تعمیل

تھانہ داران اور کوتوال بخوبی نہیں کرتے اور خبرگیری اون کی کوشش سے نہیں ہوتی۔ ایسا مناسب نہیں اس واسطے حکم ہوا کہ

> پروانہ بنام کوتوال اور تھانہ داران شہر اور انارکلی کے جاری ہوئے کہ بموجب حکم سابق کے تعمیل اس کی بخوبی کریں اور نگرانی اس کی رکھیں۔ اگر پھر ہم برخلاف حکم کے دیکھینگے، تو حکم مناسب ہوگا اور نسبت طوایفان کے حکم اوٹھا دیا جانے کا ہوگا۔

(۲۲ نومبر ۱۸۵۹ء)

۴۔ امرتسر میں چنگی کے محصول کے قواعد شائع ہوئے ہیں (ضمیمہ ۲۲ نومبر ۱۸۵۹ء)

۵۔ لدھیانہ میں ٹھیکہ چنگی بشرح فیصدی چار روپیہ ۸ رہوا ہے (۶ دسمبر ۱۸۵۹ء)

۶۔ حسب منظوری سوپریم گورمنٹ یہ تجویز ہوئی ہے کہ ۱۲ اپریل سے نمک پنجاب پر بمقام کان نمک جو صاحب کلکٹر بہادر نمک کے اہتمام میں ہے بجائے عہ (۲ روپیہ) فی من کہ ۸۰ پونڈ کے مساوی ہے، عہ (۲ روپیہ ۲ آنہ) محصول لیا جاوے اور محصول نمک کان کوہاٹ میں کچھ اضافہ یا کمی نہ کی جاویگی (۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء)

[کان نمک پنجاب سے مراد کھیوڑہ ہے، جہاں کا نمک مشہور ہے۔
من میں وزن ۸۰ پونڈ نہیں، بلکہ ۸۲ پونڈ کے قریب ہوتا ہے]۔

۷۔ ۷ تاریخ فروری ۱۸۶۰ء کو سورت سے بروچ تک سڑک آہنی جاری ہوگئی، اور عوام کو بھی اجازت آمد و رفت کی دی گئی۔ اوس تاریخ صبح کو صدہا آدمی تماشا دیکھنے کو جمع ہوئے، اور اوسی دن قریب ۸ سو آدمیوں کے سورت سے بروچ کو بسواری دخانی گاڑی گئے (۳ مارچ ۱۸۶۰ء)

۸۔ واسطے تجویز تقرر مدرسۂ انگریزی بمقام لاہور ۲۷ فروری ۱۸۶۰ء کو حضوری باغ میں ایک جلسۂ عالی قرار پایا جس میں۔ ۔ ۔ (رؤسائے شہر کے نام) رونق افروز ہوئے اور صاحب ڈپٹی کمشنر (اور دوسرے افسران) تشریف لائے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے رئیسوں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ سرکار کا منشا ہے کہ

لاہور میں ایک اسکول ایسا مقرر کرے، جس میں ادنیٰ و اعلیٰ درجہ کے لوگ تعلیم بخوبی پاویں اور جب سلسلہ ترقی علم کا خاطر خواہ جاری ہو جاوے۔ تو کوئی تدبیر اس کے کالج بنانے کی کی جاوے۔ سو بلحاظ ان امور کے بعد خوض جملہ مراتب یہ بات فیصلہ پائی ہے کہ اس مدرسے میں تین جماعت قرار پاویں؛ اول میں اطفالِ رئیساں تعلیم پاویں۔ دوم، میں اطفال صرافاں و ساہوکاران و دیگر تاجرانِ متمول۔ سوم میں غریب لوگوں کے اطفال تحصیلِ علوم کریں ـــ

(۳۱ مارچ ۱۸۶۰)

۹۔ مدرسہ انگریزی تعلیم۔۔۔ کے لیے باہتمام مسٹر جی سی میڈی صاحب مدرس سابق بریلی مقرر ہوا ہے۔ فی طفل رئیس حد تین روپیہ۔ اور فی طفل تاجر یا ساہوکار ۸ر ماہوار فیس مقرر ہوئی ہے۔۔۔ مکان مدرسہ بالفعل حویلی راجہ سوچیت سنگھ میں قرار پایا ہے۔۔ ۱۲ مارچ ۱۸۶۰ء روز دوشنبہ کو یہ مدرسہ جاری ہوگا (۱۰ مارچ ۱۸۶۰ء)

۱۰۔ اشتہار: از آنجا کہ امیر کبیر وزیر اعظم کشورِ ہند نے لاہور میں ایک مدرسہ ڈاکٹری کا مقرر کیا جانا منظور فرمالیا ہے؛ فریق اول۔۔۔ میں وہ طالب علم ہونگے جن کو بہ اسسٹنٹ سرجن بنانے کے لائق تعلیم دی جاویگی، جن کی عمر سولہ سال سے کم نہوگی اور۔۔۔ داخل کیے جانے سے پہلے ان کو انگریزی زبان میں امتحان دینا ہوگا۔۔ حساب میں بھی ان کو۔۔۔ کسورِ اعشاریہ تک دخل ہونا ضروری ہوگا۔ جو شخص اس فریق میں نہایت ہوشیار اور لائق ہوں، ان کو عنہ۲۰ روپیہ مہینے تک کی اسکالری ملیگی چار سے چھ سکالرشپ تک اس فریق میں دی جاوینگی۔۔ اس فریق میں تعلیم کی مدت پانچ سال تک ہوگی۔

فریق دوم میں ایسی تعلیم ہوگی، جو نیٹو ڈاکٹروں کے بنانے کے لائق ہوگی۔ اس میں پنجاب کے رہنے والے داخل کیے جاوینگے اور عمر طالب علموں کی سولہ سال سے کم نہ ہونی چاہیے۔ داخل کیے جانے سے پہلے۔۔ ہندستانی اور پنجابی زبان میں امتحان دینا ہوگا

اور اصول حساب میں ان کو اچھا دخل ہونا چاہیے
اس فریق کے طالب علم بطور فوج کے آدمیوں کے بھرتی ہونگے اور جنگی قواعد کے پابند رہیں گے . . . مدت تعلیم . . . تین سال تک ہوگی . ہندستانی فریق کے طالب علم اگر انگریزی زبان میں ہوشیار ہو جاویں اور . . تعلیم طب . . کے اکتساب کی فہم اچھی معلوم ہو، تو ان کے واسطے یہ امر حاصل ہوگا کہ اونچے فریق میں منتقل ہو کر عہدہ سب اسسٹنٹ سرجن کی تحصیل کی لیاقت حاصل کریں۔

(۷ اپریل ۱۸۶۰ء)

۱۱۔ بموجب زاید گورنمنٹ گزٹ نمبر ۷۶، ۱۳، شملہ ۲۰ اپریل ۱۸۶۰ء کی بنا پر یہ خبر کہ سلسلہ تار برقی جس کے ذریعے سے مملکت ہند انگلستان کے ساتھ ملائی گئی ہے، انجام کو پہنچا ہے (۵ مئی ۱۸۶۰ء)

۱۲۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ضلع آگرہ میں لوہے کی سڑک بہت تاکید کے ساتھ تیار ہو رہی ہے اور الٰہ آباد کی طرف کام خوب جاری ہے . جو سڑک کہ اعتماد پور سے علی گڑھ کو جائیگی، اس کی منظوری سرکار سے آگئی لیکن سامان اس پر بھی بہت سا جمع ہے اور مٹی کا کام اکثر بن گیا . راقم اس خبر کے لکھتے ہیں کہ آثار سے یقین ہوتا ہے کہ یکم مئی ۱۸۶۱ء تک الٰہ آباد تا آگرہ دخانی گاڑیوں کی آمد و رفت جاری ہو جائیگی . (۱۶ جون ۱۸۶۰ء)

۱۳۔ شکوہ آباد سے آگرہ تک آہنی سڑک بالکل تیار ہے (۲۵ اگست ۱۸۶۰ء)

۱۴۔ ہندستان میں ابتدائے ۱۸۵۳ء سے جنوری ۱۸۶۰ء تک آہنی سڑک اور گردونِ دخانی کے صرف میں دو کروڑ تریسٹھ لاکھ چھ ہزار ستر روپیہ خرچ ہوا اور آمدنی ابتدائے جولائی ۱۸۵۶ء سے جنوری ۱۸۶۰ء تک پندرہ لاکھ ستاون ہزار ایک سو اکہتر روپیہ ہوئی (ایضاً)

۱۵۔ میڈیکل کالج . . . خاص لاہور اس مہینے (یعنی نومبر ۱۸۶۰ء) کی یکم تاریخ سے . . . لاہور میں قائم ہو کر بہت شاگرد بعد امتحان کے بھرتی ہوئے . جی بی سکر بون صاحب اسسٹنٹ

مسٹر جن پرنسپل و پروفیسر سرجری۔ (دوسرے اساتذہ کے نام بھی ہیں (۱۰ نومبر ۱۸۶۰ء)

۱۶۔ اخبار مجمع البحرین میں از روے اخبارات بمبئی لکھا دیکھا کہ مابین سورت اور بلسر کے کام سڑک آہنی کا ۳۱ اکتوبر کو اجرا پا دیگا۔ پل دریاے تاپتی کا بڑا طویل اور عریض اور نہایت مستحکم اور استوار بنا ہے، طول اس کا چار سو گز ہے جس میں ۱۵۰ ستون ... اور تیس محرابیں ہیں (یکم دسمبر ۱۸۶۰ء)

(۳)

بہت مدت کے بعد مجھے انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دلی کے کتابخانے میں ایک مجلد دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس میں "کوہ نور" کے چار برسوں کے متفرق شمارے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۹۵۱ء : جون (۲۴)؛ جولائی (۱، ۵، ۸، ۱۲)

۱۹۵۳ء : نومبر (۲۲)؛ دسمبر (۲۰، ۲۷)

۱۹۵۴ء : مارچ (۲۱)؛ اپریل (۱۱، ۱۸)؛ جون (۶، ۲۷)؛
جولائی (۴، ۱۸)؛ اگست (۸)؛ ستمبر (۵، ۱۲، ۱۹)؛
اکتوبر (۳)؛ نومبر (۷، ۱۴)؛ دسمبر (۱۲، ۲۶)

۱۹۵۵ء : جنوری (۲، ۹، ۱۶، ۲۳، ۳۰)؛ فروری (۱۳، ۲۰)؛
مارچ (۶، ۱۳)؛ اپریل (۳، ۱۰، ۱۷)؛ مئی (۸، ۱۵، ۲۲،
۲۹)؛ جون (۵، ۱۲، ۱۹، ۲۶)؛ جولائی (۳، ۱۰،
۱۷، ۲۴)؛ ستمبر (۴، ۱۱)

شروع کے پرچوں سے معلوم ہوا کہ پہلے یہ اخبار ہفتے میں دو بار ہر شنبہ اور ہر سہ شنبہ کو چھاپا جاتا تھا؛ اور اس کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ چونکہ ۱۹۵۳ء میں یہ ہفتہ وار چھپ رہا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ ۱۹۵۱ء کے آخری مہینوں یا ۱۹۵۲ء

کے دوران میں کسی وقت یہ ہفتے میں دو بار کی جگہ ہفتہ وار چھپنے لگا۔

اس مجلّد کے شمولہ شماروں سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف پرچے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے، وہیں اسے ایک طرح سے سرکاری گزٹ کی بھی شکل دے دی گئی ہے۔ ہر شمارے میں سرکاری عہدہ داروں کی نقل وحرکت، ان کے تبادلے، مختلف قوانین کا پورا پورا متن، ان سے متعلق ذیلی قواعد، پورے شرح وبسط سے شائع ہوئے ہیں۔

بیرونی ممالک کی خبروں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ مثلاً افغانستان، چین، روم، روس، یورپ کے مختلف ممالک وغیرہ کی خبریں کثرت سے ملتی ہیں، اور وہ بھی خاصی تفصیل میں۔

پرچہ اگرچہ بنیادی طور پر سرکاری اور اخباری معلومات کے بارے میں ہے، لیکن اس میں علمی اور ادبی چاشنی بھی پیدا کرنے کی کوشش مفقود نہیں ہے، گاہے ماہے شعرا کا اردو فارسی کلام بھی چھاپا گیا ہے۔ مثلاً ان شعرا کا کلام ان شماروں میں ملتا ہے:-

۱۔ ذوق۔ ان کا ایک قصیدہ تہنیت عید ۱۲ نومبر ۱۸۴۵ء کے شمارے میں ہے:

مصحفِ رخ ترا اے سایۂ ربّ العزّت
کھول دے معنیٔ انعمت علیکم نعمت

۲۔ شیخ اللہ دیا صاحب منشی محکمۂ فنانشل کمشنری، لاہور متخلص بہ عاصی
۳۔ پنڈت نرائن داس صاحب دہلوی خوشنویس مطبع کوہ نور متخلص بہ مظہر
۴۔ سید انور حسین شاہ صاحب رسول شاہی متخلص بہ ہما
۵۔ منشی ہرگوپال صاحب سکندرآبادی متخلص بہ تفتہ
۶۔ مولوی خوتزم صاحب (قطعات تاریخ وفات فقیر سید چراغ دین بخاری خلف الرشید فقیر عزیز الدین)

۷ ۔ جناب شاہ محمد کبیر قادری صاحب تخلص کبیری متوطن خواص کشمیر
۸ ۔ محمد مردان علی خاں صاحب کوتوال کوہ مری، متخلص بہ مضطر

۱۸۵۵ء کے آغاز سے ہر مہینے کے مندرجات کی فہرست بھی شائع ہونا شروع ہوئی تاکہ جو لوگ اخبار کا فائل محفوظ رکھتے ہیں اور اس کی جلد بندھوا لیتے ہیں، وہ اسے اس کے شروع میں لگوا دیں جس سے انھیں کسی خاص خبر کی تلاش میں آسانی ہو۔ چنانچہ جنوری ۱۸۵۵ء کے مشمولات کی فہرست اس کے بعد فروری میں شائع ہوئی ہے۔ اب ان شماروں کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو۔ خبروں کے بعد کسی کسی جگہ میں نے وضاحت کے لیے بریکٹ کے اندر اپنی طرف سے مناسب اضافہ کر دیا ہے۔

۱۔ سیاسی وسماجی خبریں

خبر لکھنؤ:

حضرت جہاں پناہ کی شادی دختر وزیر سے ہوئی اور جلسہ دعوت کا چند روز بڑا عظیم ہو۔ اگرچہ ابتدا میں نواب اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے ناراض تھا، مگر اب خوش ہے کیونکہ اوس کے اختیارات اور زیادہ ہو گئے۔ اور چونکہ اور بھی لڑکیاں اوس کی ہیں، یقین ہے کہ، ولی عہد کو بھی اپنا داماد بنائے۔ یہ عروسِ جدید پہلے کسی اور سے منکوح ہوئی تھی، مگر حضرت نے اس کا کچھ خیال نکیا، اور وزیر سے فرمایا کہ اگر تمھاری لڑکی بھی کام نہ آئے، تو تمھاری وزارت سے کیا حاصل! اور اس عوض خدمت میں جو جاگیر محمر مٹھ پہلے اوس کی جاداد میں تھی، اوس کو واگذار ہوگئی، اور محاصل اوس کا ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہے اور بیگم صاحبہ کو جاگیر ضلع سلون میں بقدر نو لاکھ روپیہ سالانہ مقرر ہوئی۔ اور علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سے منافع ہوئے۔ (یکم جولائی ۱۸۵۱ء)

[یہ واجد علی شاہ کی علی نقی خاں وزیر کی بیٹی سے شادی کی طرف اشارہ ہے۔

یہ اس کی تیسری بیٹی تھی۔ شادی ۴ شعبان ۱۲۶۷ھ مطابق ۵ جون ۱۸۵۱ء بروز جمعرات ہوئی تھی۔

(دیکھیے، تاریخ اودھ (از حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری) ۵: ۹۰)

رسم دختر کشی:

اخباروں کے دیکھنے سے... معلوم ہوا کہ رسم دختر کشی کی علاوہ پنجاب کے قوم راجپوت چوہان و کھتری وغیرہ ساکنان ملک ہندستان میں بھی جاری تھی۔ مگر اب مسٹر چارلس کس صاحب بہادر سابق مجسٹریٹ و کلکٹر مین پوری، حال کمشنر قسمت لاہور کی کوشش سے اس رسم کی اصلاح ہو گئی۔ اور حسب منظوری گورنمنٹ، صاحب ممدوح نے ایک بڑا جلسہ مین پوری میں کر کے تمام راجپوتوں کی استرضا سے اخراجات شادی کے بہت کم کرا دیے۔ اور یقین ہے کہ یہ بد رسم مسدود ہو گئی۔ (۲۳ نومبر ۱۸۵۳ء)

خبر نہر گنگا جی

واضح ہو کہ آٹھویں تاریخ [اپریل ۱۸۵۴ء] کو نہر گنگا جی کی جس کا مدت سے انتظار تھا، جاری ہو گئی۔ ... یہ نہر چار سو کوس کے اندر رہے یعنی ہردوار سے لے کر تا بہ الٰہ آباد اور ایسی وسیع کہ جس کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے (۱۸ اپریل ۱۸۵۴ء)

سزائے قتل،

دہلی گزٹ سے معلوم ہوا کہ مسٹر جان کلبی صاحب کورٹ ماسٹر ملازم رجمنٹ ۹۸ پیادہ بادشاہی نے جو ایک نوکر کو قتل کیا تھا، اور مقدمہ عدالت کورٹ میں زیر تحقیقات تھا، سو بوجہ اس بات کے کہ مقتول سے قاتل صاحب کی عداوت سابقہ کچھ نہ تھی؛ آول کورٹ میں ۲۴ فروری کو مجرم کے حق میں حکم قید رہنے چار برس کا قلعہ آگرہ میں تجویز ہوا۔ اور تجویز ثانی میں ۱۵ مئی ۱۸۵۴ء کو حکم جلا وطنی ۱۴ برس کا دیا گیا۔

اور اس پچھلی تجویز کو کمانڈر انچیف اور گورنر جنرل بہادر نے پسند فرمایا۔
اس خبر کو پڑھ کر اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ (یہ جرم اور یہ سزا) تو جواب اس کا صرف اس قدر کافی ہے کہ مقتول تو محض چمار کالے رنگ کا تھا، اور قاتل صاحب لوگ رنگ گورا تھا۔ اس واسطے اس مقدمے میں ایسی ہی سزا مناسب تھی (۶ جون ۱۸۵۴ء)

[آخری سطروں میں بین السطور جس طرح انگریزی انصاف کا خاکا اڑایا گیا ہے، وہ قابلِ داد ہے۔]

خبر اودھ:

خاصے قمر الدولہ بہادر کے اور اکثر اخبارات سے معلوم ہوا کہ پنجشنبہ کے دن چھٹی تاریخ ربیع الاول کے علم مبارک کو کمال آداب اور جلوس سے صاحب عالم میرزا محمد نورالدین شاہزادۂ تیموریہ درگاہ شریف میں لے گئے۔ اور اس طرح سے کہ آج تک لکھنؤ میں ایسا جلسہ، ایسا میلا کوئی ہوا، نہ ایسا تعزیہ اُدھا، نہ کسی دن ایسی سواری بادشاہِ اودھ کی ہوئی۔ (۲۰ دسمبر ۱۸۵۴ء)

خبر دہلی:

اخبارات سے معلوم ہوا کہ سلاطین دہلی نے درخواست اضافۂ معاش معینہ کی گورنمنٹ میں کی تھی کیونکہ بسبب کثرت سلاطین و بیگمات کے پنشن اون کی فی الجملہ پہلے سے بہت کم ہے۔ مگر گورنمنٹ سے درخواست اون کی نامنظور ہوئی، اور حکم صادر ہوا کہ وہ اپنا گذارہ نوکری سے، خواہ کسی پیشہ سے کریں۔ اور علاوہ اس کے، کیونکہ قلعۂ دہلی میں بسبب کثرت خاندان شاہی و متعلقین کے بہت ہجوم رہتا ہے اور مکانات کی کشمکش، سلاطین موصوف آیندہ سے قطب صاحب میں رہا کریں گے۔ اور میرزا فخرو بھی بعد تخت نشینی کے قطب صاحب ہی میں رونق افروز رہا کریں گے۔

(۵ ستمبر ۱۸۵۴ء)

(مرزا فخرو سے بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ کے ولی عہد
غلام فخر الدین مراد ہیں)

خبر شاہ دہلی:

اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ جن دنوں میں نواب لارڈ الن برا صاحب بہادر سنہ کے گورنر جنرل تھے، اونھوں نے شاہ جم جاہ دہلی سے ملاقات چاہی تھی، اور یہ تمنا کی تھی کہ دربار میں بادشاہ کے برابر چوکی پر بیٹھیں۔ مگر جب حضرت سلطانی سے یہ امر نامنظور رہا، تب نواب ممدوح نے تحریر کر کے نذرانہ سالانہ جو سرکار فیض مدار انگریزی سے مقرر تھا، بند کروادیا۔ اب بندگانِ شاہی چاہتے ہیں کہ اس سال کے آخر تک اس مقدمہ میں حکامِ ولایت سے سلسلہ جنبانی کریں، لیکن صاحب مہتمم ہرکارہ اخبار کی یہ رائے ہے کہ بادشاہ سلامت اس باب میں ناحق زیر بار نہوں اور تکلیف نہ کریں (از اخبار الحقائق) (۱۹ ستمبر ۱۸۵۴ء)

خبر دہلی:

اخبار انڈین اسٹینڈرڈ سے معلوم ہوا کہ ایک وارداتِ عظیم قتلِ سنگین کی قلعۂ معلّی، دہلی میں وقوع میں آئی۔ یعنی ایک بیگم صاحبہ نے کسی کنیزِ خورد سال کو ہلاک کیا۔ صاحبِ خبر لکھتے ہیں کہ اس واردات کی تفصیل بڑی حیرت افزا ہے، مگر اس قدر معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ اس کنیز سے کسی باعث سے بہت خفا ہو گئیں اور بعالم غضبناکی ایک سلاخ آہنی گرم کرا کر اوس کے جسم میں گھسیڑ دی اور اوس کو نہایت بیرحمی سے مارا۔ بعد اوس کے ایک چادر میں اس کے جسم کو لپٹوا کر گھر سے باہر پھنکوا دیا کہ اس حالت میں سسکتی ہوئی کنیز مذکور پائی گئی۔ صرف اظہار لینے تک زندہ رہی، بعد ازاں مر گئی۔ اب مقدمہ دہلی کی ایجنسی میں رُوبکار ہے اور صاحب اجنٹ گورنر جنرل نے گورنمنٹ کو رپورٹ کی ہے۔ سابق میں جو سزا ایک

شہزادہ کو بعلت قتل اپنی زوجہ کے ملی تھی، اوس کوشاید اہل قلعہ بھول گئے۔ اب دیکھیے اس مقدمہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے! یقین ہے کہ حکام عہد اچھی طرح انصاف کرینگے۔ اب حضرت شاہ دہلی بہت ضعیف ہیں اور وزرا ان کے مرتشی۔ پس معاملاً فوجداری میں دخل سرکار انگریزی کا خواہ مخواہ لازم آیا، تاکہ امن جان و مال کا ہو جاوے (۶ مارچ ۱۸۵۵ء)

خبر حسرت اثر ضبطی ملک لکھنؤ:

صاحب شعاع الشمس (ملتان) لکھتے ہیں کہ آفتاب اوج سلطنت لکھنؤ حضیض زوال میں آیا، اور صبح اقبال اوس دولت کی بشام ناکامی مبدل ہوئی، عروج نشۂ بدانتظامی نے انجام کو زنگ خمار دکھلایا، اور آتش آہ رعایاے مظلوم نے خانمان سلطنت کو جلایا۔ مدت سے حالات بدانتظامی اوس سلطنت کے متواتر سن کر ہم سمجھتے تھے کہ متوالے کی دستار ہے، آج نہ گری، کل گری۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ صاحب اخبار جام جہاں نما، کلکتہ بحوالۂ اخبار انگلش مین زیب رقم فرماتے ہیں کہ حکم واثق و فرمان صادق صاحبان آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کا بنام امیر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند بدیں مضمون صادر ہوا کہ ملک شاہ اودھ شامل ملک سرکار انگریزی کے کیا جاوے، اور نصف محاصل صوبہ اودھ کا بطور پرورش واسطے حوائج ضرور یہ حضرت جہاں پناہ لکھنؤ کے دیا جائے۔ کہتے ہیں کہ جناب نواب گورنر جنرل بہادر قبل از تشریف بری ولایت جزو کل انتظام شمول اس ملک کا فرمائینگے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ مبادا کچھ غلطی کسی مترجم کی ہو۔ صاحب شعاع الشمس خفا نہ ہوں، بلکہ ترجمہ انگلش مین کو صفحہ ۱۷۴ اس اخبار میں ملاحظہ فرمائیں۔ (۶ مارچ ۱۸۵۵ء)

[یہ خبر یقیناً غلط تھی، واجد علی شاہ ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو معزول

ہوئے۔ "لکھنؤ شد خراب واویلا" (۱۲۷۲) اس کی تاریخ ہے تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ اودھ (۵) از محمد نجم الغنی رامپوری۔ پس یقیناً شعاع الشمس کی خبر غلط تھی)

۲ — علمی و ادبی خبریں

مطبعِ نو:

مقام لدھیانہ میں ایک مطبع مسمیٰ "بہ نور اً علیٰ نور" قائم ہوا ہے ۔ ۔ ۔ لکھتے ہیں کہ اس مطبعِ عالی میں ہر ہفتہ ایک اخبار چھپے گا و بتوجہ احسن مہتمم صاحب کتب و کاغذات بھی ہر ایک علم مُروّجۂ ملک کے قالبِ طبع میں آویں گے (۱۲ جولائی ۱۸۵۱ء)

اطلاع:

بخدمت شایقانِ مشاعرہ مطبع کوہِ نور، لاہور یہ ہے کہ پہلے سے جو جلسہ مشاعرہ کا ہر یکشنبہ کو سات بجے شام سے ہوتا تھا، اب حسبِ صلاحِ احباب اجتماعِ جلسۂ مذکور پانچ بجے شام سے قرار پایا ہے ۔ ۔ ۔ چنانچہ اس ہفتہ کے مشاعرہ کے مصراعِ طرحی یہ ہیں:

طرحِ فارسی: کلہ کج کردہ، خنجر بکف، مستانہ می آید
طرحِ اردو: غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

(۲۱ مارچ ۱۸۵۴ء)

(اس کے بعد کے تقریباً ہر شمارے میں دو طرحیں ملتی ہیں)

مطابع جدیدہ:

خبر یہ ہے کہ ایک مطبع جدید بنام "گلزارِ پنجاب" سری امرتسر جی میں باہتمام رکھی سنگھ

نام کسی بزرگ کے، . . .
اور دوسرا مطبع بنام "مطبع مرتضائی" باہتمام حاجی علی لرم صاحب نام کے خاص شہر پشاور میں جاری ہوا ہے۔
اور تیسرا مطبع لاہور میں باہتمام مولوی سلطان احمد صاحب نام ایک بزرگ کتب فروش کے، کتابیں چھاپنے کے . . . جاری ہونے والا ہے۔
خدائے کریم ان کی عمر دراز کرے اور ترقی بخشے۔ اب پنجاب میں ماشاء اللہ نو دس مطبع شمار میں آتے ہیں (۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء)

اشتہار زینت الخیل

کچھ عرصہ سے جو ایک کتاب فرسنامہ، "زینت الخیل" نام اس مطبع میں چھپ رہی تھی، فضلِ ایزدی سے ہفتہ گزشتہ میں ختم ہو گئی اور جلد بندی ہونے لگی۔
یہ کتاب فرسنامہ عجیب و غریب بلکہ نایاب چیز ہے۔ اوس کو چند استادان پُر فن نے جمع ہو کر کتب عربی و فارسی اور ہندی اور شاستری تالیفات شل یوسفی و تمکین دہلوی و نظام الدین ایرانی و حاجی عبدالوہاب بخاری و نکل ہندی و ہاشمی صیفی اصفہانی اور اشو درین پوتھی ہندی اور دیگر رسالہائے متعدد سے نظم دلچسپ میں موزوں کیا ہے اور گھوڑے کے جتنے عیوب جلدی، خواہ شعری یا استخوانی ہیں، اور جتنی بیماریاں کتب سے معلوم ہوئی ہیں، ان سب کے حسن و قبح کی تفصیل اور علاج معالجہ کی شرح بشرح و بسط لکھی ہے۔ اور ہر امر کو دو طرح سے ادا کیا ہے۔ ایک تو تحریر اً نظم اردو میں نہایت صاف اور سلیس، اور دوسرے تصویرات میں ہر یک بیماری یا عیب گھوڑے کی اصل شکل کو دکھلایا ہے۔ اور مطبع میں نظم اوس کی بہت صاف اور خوش قلم کاغذ عمدہ پر چھاپی گئی ہے۔ اور تصویرات بھی بہت عمدہ رنگین اور نیز سادہ چھاپ کر لگائی گئی ہیں۔ ۔ ۲۶ جز کی ضخامت ہے؛ اور قریب اسی ورق کے، تصویرات خوش قلم ہیں۔ ۔ جس صاحب کو لینا

کتاب کا مرغوب ہو، عہ روپے بھیج کر مہتمم "کوہ نور" کے پاس سے منگالے . . .

(۱۸ جولائی ۱۸۵۴ء)

غزل میرزا خاور صاحب

گفتم کہ با منی تو گفتی بمن کہ آرے — چوں نیک در تو دیدم با من نہ تو بارے
رشکِ رقیب ہرگز نتواں نہاد در دل — خوتر کسے کہ نبود در پہلوے نگارے
تنہائی شبِ ہجر آں کس، بگو، چہ داند — کہ آرام خفتہ باشد در گوشۂ مزارے
حیف است نازنینے چوں تو، برِ رقیباں — عاقل کجا پسندد، گل را بدستِ خارے
از دیدہ گور بہتر، گر سیرِ باغ جوید — آں کو نجانہ دارد معشوقِ گلعذارے
برخیز د چند جامے، ساقی! بکارِ من کن — دریاب پیش زاں، کیت ناید بدست کارے
ہر چند خاک ریزد دشمن بروز گارش — یارب مباد از من بردامنت غبارے
اد گردشِ زمانہ رستی ازاں کہ داری — دستے بدستِ ساغر، چشمے بچشم یارے

مشکل تواں سرودن، خاور! جوابِ حافظ
اے زیدلاو بالی! کردی شگفت کارے

(۱۹ ستمبر ۱۸۵۴ء)

[خاور کا پورا نام میرزا محمد اکبر خان قزلباش سیستانی تھا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ اُردو کلام پر میر وزیر علی صبا لکھنوی سے اور فارسی پر غالب سے اصلاح لی۔ مفصل حالات کے لیے دیکھیے "تلامذۂ غالب" (۱۶۸ - ۱۷۱)]

اشتہار

منشی امین چند سر رشتہ دار کلکٹری راولپنڈی نے کہ جن کے اوصاف حمیدہ اور عاداتِ پسندیدہ اس ملک میں مثل آفتاب روشن ہیں۔ جو ۱۸۵۰ء و ۱۸۵۱ء میں اپنی طبیعت کے شوق سے سیر ملک محفوظ دپنجاب کشمیر و پشاور و سندھ و بمبئی و پونہ د

اندور و اوجین و اجمیر و جیپور و بھرت پور و آگرہ و دہلی و متھرا و بندر ابن و کور چھیتر و رڑکی و ہردوار و ڈیرہ دون وغیرہ کی فرمائی تھی۔ ۔ ۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ ایک کتاب تعلیم پٹواریاں تصنیف فرمائی اور وہ کتاب پسندِ حکام وقت ہوکر چھاپی گئی۔ ۔ ۔ اور جناب فناشنل کمشنر صاحب بہادر ملک پنجاب نے بھی اوس کی پسند کے باب میں پروانہ خوشنودی بھیجا۔ لہٰذا منشی موصوف نے حسب ایمائے جناب ماسٹر رابرٹ کسٹ صاحب بہادر سابق ڈپٹی کمشنر جالندھر و حال مجسٹریٹ و کلکٹر ضلع باندہ انھوں نے اپنی سیر کو ہر مقام اور موضع اور موقع پر قلم فرمایا اور جو کچھ دریافت ہوا، بہت صاف اور ٹھیک لکھا۔ یہ تمام تحریر اون کی مطول ہوگئی کہ دو جلدوں میں سمائی۔ اب جلد اول اوس کی حسب ایمائے آقا نعمت اون کے دہلی میں چھپ کر تیار ہوگئی۔ ۔ جس صاحب کو مطلوب ہو تین روپیہ نقد پاس ماسٹر رام چندر صاحب مدرس کالج، دہلی کے بھیج کر منگالے۔ ۔ ۔ اور اگر کسی صاحب کو دہلی سے منگانے اور روپیہ بھیجنے میں کچھ دقت معلوم ہوتی ہو تو زرِ مذکور پاس منشی صاحب موصوف کے راولپنڈی میں بھیج دے۔ کتاب دہلی سے پہونچیگی۔ (۲۳ دسمبر ۱۸۵۴ء)

[کوئی ۳۲ - ۳۳ برس ہوئے، اس سفر نامے کا ایک ناقص الآول و آخر نسخہ یہاں دہلی میں میری نظر سے گزرا۔ کتاب تو میں نے پڑھ لی، لیکن نہ اس کا نام معلوم ہوا، نہ اس کے مصنف کا۔ ایک مدت بعد پیرس (فرانس) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں L'ECOLE NATIONALE DES LANGUES VIVANTS کے کتابخانے میں اس کا مکمل نسخہ ملا۔ اس کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

سفرنامہ
منشی امین چند صاحب ساکن پنجاب
مشتمل بر دو حصّہ
حصّۂ اول

بیان سیر ملک پنجاب وکشمیر و سندھ و برخی از ملک دکن وخاندیس، مالوہ، دراجپوتانہ

حصّۂ دوم

بیان سیر بعض اضلاع ممالک مغربی و اودھ مع عجائبات و نادرات واقعہ

حسب ایما

ارسطوے زمان جناب رابرٹ کسٹ صاحب بہادر

۱۸۵۹ء

مطبع کوہ نور، لاہور میں پنڈت سورج بھان کے اہتمام سے چھپا

اس سے ثابت ہوا کہ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ کوہ نور کے مندرجہ صدر اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف حصّہ اول ۱۸۵۴ء میں دلی سے غالباً ماسٹر رام چندر کی نگرانی میں شائع ہوا تھا۔ بعد کو دونوں حصّے یکجا مطبع کوہ نور، لاہور میں ۱۸۵۹ء میں چھپے]

کتاب بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے، اور سلیس زبان میں۔ اس زمانے میں ان مقامات کی سماجی اور ادبی زندگی کا مرقع پیش کرتی ہے

اجرائے مطبع جدید

بہ رسید اشتہار اخبار نمبر اول مطبوعہ ۲۳ دسمبر سنہ حال روشن ہوا کہ افق ٹالہ (بٹالہ ضلع گورداس پور پنجاب) میں "نیر اعظم" ایک اخبار باہتمام مفتی محمد بخش صاحب پر تو طلوع ہوا۔۔۔ شکر ہے کہ اب پنجاب میں ترقی تعلیم کے سامان تازہ بتازہ مہیا ہوتے جاتے ہیں (۲۶ دسمبر ۱۸۵۴ء)

[اس سے معلوم ہوا کہ "نیر اعظم" بٹالہ کا پہلا شمارہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۴ء کو شائع ہوا۔ یہ بھی غالباً اپنے بیشتر ہمعصروں کی طرح ہفتہ وار تھا]

شکریہ

ناظرین۔۔۔ کوہ نور، لاہور پر واضح ہو کہ یہ مطبع۔۔ جنوری ۱۸۵۰ء سے جاری ہے۔ وقت اجرا اس مطبع کے نہ کوئی اور مطبع اس ملک۔۔۔ پنجاب میں تھا، اور نہ نظم ونسق سلطنت کا استقلال ہوا تھا۔ اس شرح سے گویا عمر اس شرافت پناہ کی پوری

پانچ برس کی ہے ۔ ۔ ۔ یہ امر صرف فیض رسانی اور قدردانیِ شفقا میں داخل ہے، نہ کہ میری خوش طبعی اور خوشگوئی سے متعلق ۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۴ء تک کہ کل جس کا چار برس کا ہوا میں نے مثل اجنٹ مجسٹریٹ لاہور و گوجرانوالہ و دیگر موذی روزگار مردم آزار مثل نہال لاہور وغیرہ کو کہ جن کے ظلم اور تعدی کا شہرہ افق سے شفق تک اظہر من الشمس تھا، نہایت جلادت سے زیر کیا ۔ ۔ ۔ میں نہایت شکرگزار ہوں، اون قدردانوں کا کہ جو بمقتضائے ہمت عالی و دریادلی میری یاوہ سرائی کو خوشگوئی سمجھتے ہیں اور اس سال کے اخیر تک میرے خریدار ساڑھے تین سو کے قریب ہیں ۔ پنجاب میں فضل ایزدی سے اب علم و ہنر کی اس قدر ترقی ہے کہ ہندوستان میں شاید بیس برس میں نہ ہوئی ہوگی ۔ چنانچہ کوہ نور سے لے کر لاہور کرانکل ، ریاضِ نور، ملتان؛ شعاع الشمس، ملتان؛ و چشمۂ فیض سیالکوٹ؛ و لاہور گزٹ و مطلع الانوار، گجرات؛ و مرتضائی، پشاور؛ و قادری گورداسپور گو نوزائیدہ ہے، علی الترتیب فی النسل تو (کذا) مطبع تو اب موجود ہے ۔ اور دسواں ایک مطبع گمنام یعنی کتابی، لاہور میں اور سٹرنی (کذا) لگا ہے ۔ اور گیارھویں اور بارھویں کا باپ جالندھر و خانگڑھ میں متردد ہے ۔ اور تین چار بچہ دریائے نور ، باغ نور ، ریاض نور ۔ ۔ ۔ اپنے والدوں کے نقص رحم سے قالب حیات خالی کر گئے ۔ اور ایک اپنے والدین سے عاق ہو کر جیلخانۂ امرتسر میں حبس دوام ہے ۔ گویا پندرہ سولہ اشراق زادہ اس پانچ برس میں خاص پنجاب میں پیدا ہو گئے ۔ ۔ ۔ میں نہایت شکرگزار ہوں اور بالعوض اوس کے شروع سال حال سے قیمت اخبار میں تخفیف کرتا ہوں یعنی بجائے فی ماہ عـ۸ کے عـ۴ اور بجائے مابعد سال للعـہ کے عـہ ۔

امید کہ جس طرح میرے عنایت فرما سالہائے گزشتہ میں میرے حال اور قال پر توجہ فرماتے رہے ہیں، اسی طرح آئندہ بھی مصدرِ لطف و احسان رہیں اور اپنی امداد اور عنایت دلی سے ممنون اور مشکور فرماتے رہیں ۔ (۱۶ جنوری ۱۸۵۵ء)

[اس سے معلوم ہوا کہ

(۱) کوہ نور ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا تھا۔

(۲) ۱۸۵۵ء کے شروع میں یعنی پانچ برس میں اس کی اشاعت ۲۵۰ تھی۔

(۳) اس کی دیکھا دیکھی پنجاب کے مختلف شہروں سے دس بارہ اور ہفتہ وار اخبار جاری ہوئے۔

(۴) منشی ہرسکھ رائے نے بعض لوگوں کی مخالفت کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکتی۔

(۵) پہلے پرچے کا چندہ ڈیڑھ روپیہ مہینا اور چوبیس روپیہ سالانہ تھا' جواب گھٹا کر سوا روپیہ مہینا اور بیس روپلے سالانہ کر دیا گیا]

تاریخ وفات شیخ ابراہیم ذوق مخطوب بخاقانی ہند
استادِ ظلِ سبحانی بہادر شاہ بادشاہ دہلی
مصنفہ منشی احمد علی صاحب سرشتہ دار جنٹ مجسٹریٹ
چھاونی راولپنڈی

----- (۱۸ اشعر) - - - -

رحلتِ ذوق کی تاریخ طلب کی عشاق
غیب سے جوش ہوا طبع کو جولانی کا
وقتِ رقت تھا کہ یہ مصرعہ زباں سے نکلا
"ہائے دہلی سے چلا شاہ سخندانی کا"
(۱۲۷۱)

دیگر

نالے دل سے نکل بفوقِ چلے ذوق لے کر سخن کا شوق چلے
پئے سالِ وفات کہہ عشاق ! " دارِ فانی سے ہائے ذوق چلے"
(۱۲۸۱)

دیگر

دہلی سے ذوق بلبلِ خوش داستاں گیا اعنی چمن سے دہر کے سوئے جناں گیا
عشاق ! کہہ یہ مصرعۂ تاریخ سالِ موت "دنیا سے وائے ذوق فصیح البیاں گیا"
(۱۲۷۱)

(۱۳ مارچ ۱۸۵۵ء)

۱۔ شاعر کا تخلص عشاق تھا۔
۲۔ اس خبر کے عنوان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ذوق کا خطاب صرف "خاقانیِ ہند" تھا، ملک الشعرا نہیں تھا۔
۳۔ ذوق کی وفات ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ / ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء کو ہوئی قطعہ نمبر ۲ سے (۱۲۸۱) برآمد ہوتے ہیں جو ٹھیک نہیں!

قطعۂ تاریخِ وفات میاں ذوق صاحب

از منشی صدر الدین ساکن آگرہ، وارد حال کوہ شملہ

کیسے کیسے جہان کے شعرا — یک بیک ہو گئے، فنا دیکھو
ناسخ و آتش و ضمیر و نصیر — کوئی بھی موت سے بچا دیکھو
اور طرفہ یہ غم ہوا، فی الحال — شیرِ دشتِ سخن موا، دیکھو
صدر افسوس، کیا کہی تاریخ — "ذوق دہلی میں مرگیا، دیکھو"

(۱۲۷۱)

(۱۷ اپریل ۱۸۵۵ء)

خبرِ وفاتِ والیِ رام پور

اخبارات ہند اور نیز خط آمد رام پور سے معلوم ہوا کہ نواب معلی القاب جناب عالی نواب محمد سعید خان صاحب بہادر والیِ رام پور نے اس جہانِ فانی سے عالمِ بقا کو رحلت فرمائی۔ اخبارات میں تاریخِ رحلت یکم اپریل لکھی ہے، اور خط آمد رام پور میں ۳۰ مارچ یوم یکشنبہ۔ مگر یومِ یکشنبہ کو یکم تھی، ۳۰ مارچ نہ تھی۔ اس واسطے تاریخِ وفات نواب صاحب یکم اپریل ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔۔۔ صاحب عمدۃ الاخبار، بریلی لکھتے ہیں کہ بعفور پہونچنے خبرِ حسرت اثر مذکورہ کے صاحب کمشنر بہادر

معہ صاحب کلکٹر بہادر، بریلی کے رام پور تشریف لے گئے، اور بعد ادائے رسوم تعزیت تاریخ پچیس اپریل کو نواب محمد یوسف علی خان صاحب ولی عہد بہادر کو مسندنشین کیا۔ --- (۱۷ اپریل ۱۸۵۵ء)

خبرِ دہلی

اخبار دہلی گزٹ سے ظاہر ہوا کہ مہاراجہ ہندو راؤ بہادر نے بتاریخ ۵ ستمبر صبح کے وقت دہلی میں اس جہان فانی سے رحلت کی۔ قاریانِ کرام کو معلوم ہوگا کہ یہ بزرگوار مہاراجہ صاحب مسندنشین ریاست گوالیار کے چچا تھے۔ مدت مدید سے سرکار انگریزی کی عملداری میں رہتے تھے اور ہمیشہ سیر و شکار میں مصروف رہتے تھے۔ شیر کے شکار کا بہت ذوق تھا۔ صاحب لوگوں سے ربط ضبط کا زیادہ شوق تھا (۱۱ ستمبر ۱۸۵۵ء)

[(راجہ ہندو راؤ، اپنے زمانے میں دلی کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی خاص اہم شخصیت تھے۔ پرانی دلی کا مشہور محلہ باڑہ ہندو راؤ (اور اسی پر ہندو راؤ اسپتال) انھیں سے منسوب ہیں۔ وہ مہاراجا دولت راؤ سیندھیا کے سالے (یعنی ان کی رانی بیجا بائی کے بھائی) تھے۔ دولت راؤ کی وفات کے بعد بیجا بائی ہی ان کی جگہ گوالیار کی گدی پر بیٹھی تھیں، لیکن ۹ سال بعد انگریزوں نے انھیں معزول کر دیا۔

ہندو راؤ ابتدا میں مدتوں باڑہ کے محلہ کشن گنج میں مقیم رہے۔ بعد کو مرولیم فریزر کی وفات کے بعد انھوں نے پہاڑی پر ان کا مکان خرید لیا تھا۔ فریزر دہلی میں انگریز سرکار کے ریذیڈنٹ تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو جب وہ رات کے وقت اپنے مکان واپس آ رہے تھے، کسی نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ تحقیق کے بعد نواب شمس الدین احمد خان والیِ لوہارو اور ان کا دار وغہ شکار کریم خان اس قتل کے ذمہ دار گردانے گئے اور دونوں کو پھانسی کی سزا ہوئی (تفصیلات کے لیے دیکھیے: (۱)---

واقعات دارالحکومت دہلی (بشیر الدین احمد) ۲: ۴۹۲ - ۴۹۴؛ (۲) فسانۂ غالب (مالک رام) مضمون شمس الدین احمد خان: ۹۸ - ۹۹]

نوید فرحت بخشِ جاوید

شادی کتخدائی مہاراجہ صاحب بہادر بیکانیر با دختر بلند اختر مہاراجہ سوائی راجہ بنی سنگھ بہادر والیِ الور

از روے خط ... معلوم ہوا کہ تاریخ ۱۴ جون سنۂ حال کو شادی کتخدائی مہاراجہ صاحب بہادر مہاراجہ سردار سنگھ والیِ بیکانیر کی ساتھ دختر بلند اختر... مہاراؤ راجہ سوائی بنی سنگھ بہادر والیِ الور کے ہوئی... مہاراجہ بیکانیر نے فیاضی اور دریا دلی میں راجہ اندر کو طاق میں رکھ دیا... اور مہاراجہ والیِ الور نے داد و دہش میں راجہ کرن کو خاک میں بٹھا دیا... خداوند کریم یہ شادی مبارک کرے!... صاحب خبر لکھتے ہیں کہ اول مہاراجہ والیِ الور نے چار لاکھ روپیہ نقد اور پچاسی ہزار روپیہ کا اسباب تو مہاراجہ صاحب بیکانیر کو تقریب رسم ٹیکہ عنایت فرمایا، اور ساڑھے چھ لاکھ روپیہ کا جہیز وقت شادی کے دیا اور نقد ساڑھے پانچ لاکھ روپیہ کے تقریب تنبالک یعنی بہو بد (؟) مہاراجہ بہادر بیکانیر اور مہاراؤ راجہ صاحب بہادر والیِ الور کی طرف سے خرچ ہوا۔ اور قریب ایک مہینے تک برات مہاراجہ صاحب بیکانیر کی شہر الور میں رہی، اور تقریباً دس ہزار روپے روز کا خرچ بلا ناغہ مہاراجہ بہادر راجہ صاحب الور کے رہا، اور اخراجات داد و دہش وغیرہ کے علاوہ رہے (۱۷ جولائی ۱۸۵۵ء)

[(۱) الور کے حکمران مہاراجہ بختاور سنگھ کا نام تاریخِ ادبِ اُردو میں اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ غالب کے والد عبداللہ بیگ خان کی وفات انھیں کی ملازمت کے دوران میں ہوئی تھی۔ بختاور سنگھ کے اپنا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ۱۸۱۵ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے بنے سنگھ ان کے جانشین ہوئے،

جو اس وقت صرف نو سال کے تھے۔ غالب کے خطوط میں بنے سنگھ کا ذکر آیا ہے۔
بنے سنگھ کا ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو انتقال ہوا۔
ان کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے شیو دان سنگھ گدّی پر بیٹھے، جن کی مدح میں غالب کا قصیدہ نمبر ۵۸ ان کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔

(۲) مہاراجہ سردار سنگھ اپنے والد مہاراجا رتن سنگھ کی وفات کے بعد ۱۸۵۱ء میں بیکانیر کی گدّی پر بیٹھے۔ غالب سے ان کے بھی تعلّقات تھے:

۱۸۵۹ء کا واقعہ ہے کہ مہاراجہ بیکانیر نے مرزا غالب سے فرمایش کی کہ وہ ایک "سکّہ" (سکّے پر کندہ کرنے کے لیے ایک شعر) کہہ دیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ایک عرضداشت (فارسی زبان میں) ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھیجنے کے لیے تیار کر دیں۔ مرزا صاحب نے عرضداشت کا مسودہ تیار کر دیا۔ اور دو سکّے فارسی میں لکھ کر بیکانیر اپنی ایک تحریر کے ساتھ روانہ کیے (جائزۂ زبانِ اردو (۱) انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۰ء: ۲۲۲)

مہاراجہ سردار سنگھ کا مئی ۱۸۷۲ء میں انتقال ہوا]

اس سے معلوم ہوگا کہ اس زمانے کا یہ اخبار کتنا اہم اور گرانقدر معلومات تھا۔

مخطوطات

تلاش، قرأت، ترتیب

تصنیف و تالیف کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ شروع میں اس نے اپنے خیالات کو تصویروں کے ذریعہ ادا کیا۔ آج بھی دنیا کے بعض ملکوں میں ان زبانوں کے کتبے پتھر کی چٹانوں، غاروں اور قدیم عمارتوں کی دیواروں، سنگ تراشی کے نمونوں وغیرہ پر ملتے ہیں۔ مصر کا ہیرو غلیفی اس خط کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ کتاب الاموات (BOOK OF THE DEAD) اسی خط میں لکھی ملی تھی۔ وادی سندھ کی تہذیب کے جو کتبے ملتے ہیں، یہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، اگرچہ یہ ابھی تک پڑھے نہیں جا سکے۔ بعض زبانیں آج تک اسی طرح کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں، مثلاً چینی اور جاپانی زبانیں ہیں۔

اسی تصویری رسم الخط نے مختلف ملکوں میں ارتقائی مراحل طے کر کے بالآخر حروفِ تہجی کی شکل اختیار کر لی۔ کچھ ملکوں میں اثری کھدائی کے دوران میں بیج کی کڑیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ مثلاً عراق اور ایران کا خطِ میخی ہے، یہ قدیم تصویری زبان ہے، جس میں ہر ایک حرف کسی آواز کی نمایندگی کرتا ہے۔ خطِ میخی کے مکتوبات بہت بڑی تعداد اور مقدار میں ملتے ہیں۔ پتھروں کے علاوہ ان کی بہت بڑی تعداد آگ میں پکائی ہوئی مٹی کی تختیوں پر ہے۔ اس خط میں لکھی ہوئی پوری کتابیں دستیاب ہوئی ہیں۔ بابلِ قدیم کے مشہور بادشاہ حمورابی کے قوانین کا مجموعہ اسی خط میں لکھا ہوا ملا تھا۔

بادشاہ اشور بنی پال کا پورا کتب خانہ اسی خط میں لکھا ہوا دستیاب ہو چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ خط انھیں تہذیبوں کے ساتھ مٹ گئے، جو ان کو استعمال کرتی تھیں۔ جب آثارِ قدیمہ کا شعبہ وجود میں آیا، اور اس کے بعد جا بجا قدیم شہروں کی کھدائی شروع ہوئی تو زمین نے اپنے صدیوں کے دفینے اگل دیے۔

وَاَخْرَجَتِ الاَرْضُ اَثْقَالَہَا: (قرآن، ۹۹: ۲) اب دقت یہ پیش آئی کہ ان کتبوں کی زبان پڑھنے اور سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن صد آفریں ہے ان علمائے اثریات کو جنھوں نے ان مختلف خطوں کے پڑھنے میں محنت اور جانفشانی، صبر اور استقلال کا کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا۔ انھوں نے اس کام میں عمریں صرف کر دیں۔ اس کی صرف دو مثالیں کافی ہونگی۔ مصر کا ہیروغلیفی خط ڈیڑھ ایک سو سال تک علمائے مصریات کی توجہ کا مرکز رہا۔ اس دوران میں کام آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر اسے فرانسیسی ژاں فرانسوا شامپولیاں نے ۱۸۲۲ میں حل کیا۔ دوسرا عراق و ایران کا خطِ میخی تھا۔ اس کے پڑھنے میں بھی کچھ کم محنت اور وقت صرف نہیں ہوا۔ اس میں جرمنی کے علمانے خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا اگرچہ انگریز اور امریکی بھی ان کے پیچھے نہیں تھے۔ ہنری راولنسن (انگریز) کا نام اس فہرست میں بہت نمایاں ہے۔

ایک زمانے تک یہ تحریریں اسی طرح محفوظ ہوتی رہیں۔ عراق میں پکی مٹی کی تختیاں، ایران میں پہاڑی چٹانیں، ہندستان میں بھوج پتر اور پتھر کی سلیں، مصر میں پائپرس، عرب میں چمڑے اور ہڈیوں اور کھجور کے پتوں پر یہ تحریریں ملتی ہیں۔

یہ صورت حالات تھی، جب کاغذ ایجاد ہوا۔ اس مفید ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے۔ ان سے یہ عربوں نے سیکھا اور عربوں کے ذریعے سے یہ ساری دنیا میں پھیلا۔ اس ایجاد نے علم کی ترویج و ترقی میں جو مدد دی، آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک علم خواص ہی کی سطح پر تھا۔ عوام اس سے محروم تھے۔ یہ کمی چھاپے خانے کی ایجاد نے پوری کر دی۔

اگرچہ چھاپنے کا فن چین جاپان، کوریا وغیرہ میں مدتوں سے رائج تھا، لیکن یہ انھیں

اطراف میں محدود رہا۔ یورپ میں چھاپہ خانہ پندرھویں صدی کے وسط میں جاری ہوا یہاں سب سے پہلا مطبع مینز (جرمنی) میں قائم ہوا۔ شروع میں لکڑی کے ٹکڑوں پر ابھرویں حروف کندہ کر دیے جاتے اور انھیں سے کتابیں، تصویریں، نقشے وغیرہ چھپتے تھے۔ ان کی شکل موجودہ دھاتی بلاکوں کی سی تھی۔ اس ایجاد اور اس کی ترقی کے بعد دانشی علم عوام کی دسترس میں آ گیا۔ کہاں تو وہ حالت تھی کہ کسی کتاب کے دیکھنے کو کالے کوسوں کا سفر کرنا پڑتا تھا اور اس کی نقل تیار کرنے کی دشواریاں تھیں، اور کہاں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ تھوڑے سے خرچ سے پوری کتاب، صاف ستھری چھپی ہوئی ہر کسی کو گھر بیٹھے ملنے لگی۔

مخطوطات کی تلاش

اب ضرورت پیش آئی کہ مخطوطات کو جمع کر کے انھیں چھاپنے کا انتظام کیا جائے اور یہیں سے مخطوطہ خوانی کی بنیاد پڑی۔

سب سے پہلا مسئلہ مخطوطات کی تلاش کا تھا۔ قدیم تہذیبوں کے لیے لازم تھا کہ ان شہروں کی کھدائی کی جائے، جو ان تہذیبوں کا مرکز رہے تھے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا بیشتر شہر صفحۂ زمین سے مٹ چکے تھے۔ ان کا ٹھیک محل وقوع تک کسی کو معلوم نہ تھا۔ بعض اوقات اصلی شہر کے ملبے اور کھنڈروں پر یکے بعد دیگرے اور شہر بستے گئے اور بلا مبالغہ جب تک سیکڑوں فٹ گہری کھدائی نہ ہو، اصلی شہر تک پہنچنا محال تھا۔ یہ تو پرانی تہذیبوں کا حال ہے۔

قریب کے زمانے کی صورتِ حال بھی کچھ بہت مختلف نہیں تھی۔ ہندستان ہی کو لیجیے۔ سنسکرت یہاں کی علمی زبان تھی۔ لیکن یہ نہیں کہ اس کے خطی نسخے صرف اس ملک تک محدود رہے ہوں۔ جیسا کہ معلوم ہے، قدیم زمانے میں ہندستان کے تعلقات ایشیا کے تمام ملکوں کے ساتھ تھے۔ چنانچہ سنسکرت کی کتابیں سیلون، نیپال، تبت، وسط ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف حصّوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوا

ہے کہ اصلی کتاب ایک جگہ سے اور اس کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ اور جگہ سے ملا ہے۔
اس سے اصلی نسخے کے پڑھنے اور مرتب کرنے میں جو سہولت پیدا ہو گئی، وہ ظاہر ہے۔
یہ خاص طور پر بدھ مت کی کتابوں سے متعلق ہوا۔ بدھ مت کا منبع و مرکز ہندستان
رہا لیکن اس کے مبلغوں اور مبشروں نے اسے پہلی دو تین صدیوں ہی میں ایشیا کے
بیشتر ممالک میں پھیلا دیا۔ ان ملکوں سے زائرین، سیاح، علما یہاں آتے، برسوں کی
محنت سے یہاں کے مدارس اور یونی ورسٹیوں میں رہ کر مذہبی علوم کی تعلیم حاصل
کرتے؛ اور اپنے اپنے وطن واپس جاتے ہوئے یہاں سے قلمی کتابیں ساتھ لے جاتے
وہاں پہنچ کر وہ ان کے ترجمے کرتے، تاکہ ان کے ہم وطن عوام بھی ان سے مستفیض ہو
سکیں۔ یہ کام صدیوں تک جاری رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج بدھ مت کی بنیادی
کتابوں کے اتنے مخطوطے اصلی پالی میں موجود نہیں، جتنے تراجم کی شکل میں ملتے ہیں۔
بعض سنسکرت کی کتابوں کے صرف ترجمے ہی ملتے ہیں؛ ان کی اصل ضائع ہو گئی۔
اس کی مثال میں 'پنچ تنتر' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے عربی اور فارسی ترجمے سے
دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمے ہو گئے، لیکن آج اصلی سنسکرت کتاب دستیاب
نہیں ہوتی۔ بعض اوقات مخطوطے ایسے مقامات پر مل جاتے ہیں، جس کا وہم و گمان
بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً بابل قدیم کے بادشاہ حمورابی کے قوانین جس سل پر کندہ تھے'
اس کے ٹکڑے شوصہ کی کھدائی سے برآمد ہوئے، جو ایران میں ہے۔ ناظرین غالباً
بحیرۂ مردار کے مخطوطات سے ناواقف نہیں ہوں گے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک لڑکا دن بھر
اپنی بھیڑ بکریں بحیرۂ مردار کے اُردگرد کنارے پر چرا تا رہا۔ شام کے قریب جب وہ واپس
گھر آنے لگا تو اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ کم ہے وہ اسے تلاش کرتے کرتے ایک غار میں جا
گھسا۔ وہاں اس نے چند بڑے بڑے مٹکے پڑے دیکھے۔ گھر آ کر اس نے ان کا ذکر
بڑوں سے کیا۔ قدرتی طور پر خیال کیا گیا کہ ہو نہ ہو، یہ سونے چاندی کے مدفون
خزانے ہوں گے۔ خزانہ تو وہ واقعی ثابت ہوئے، لیکن دھات کے سکوں کی شکل میں
نہیں، بلکہ علمی لحاظ سے کھولنے پر ان مٹکوں میں سے چرمے (اور ایک آدھ تانبے

کے پترے) پر لکھے ہوئے مخطوطات دستیاب ہوئے۔ اس پر قرب و جوار کے غاروں کو چھاننے سے اور بہت کچھ ملا۔ یہ تمام نسخے یہودیت اور عیسائیت کے ہمعصر اور قبل کے ایک فلسطینی مذہبی فرقے عیسینی کے معتقدات اور تاریخ سے متعلق بیش بہا معلومات کا خزانہ ہیں۔ ایک اور صورت بھی ہے ـــــ وہ عالم اور مصنف جو کسی مدرسے یا دربار سے وابستہ تھے، ان کی تصنیفات بیشتر وہیں جمع ہوتی رہیں، جہاں ان کا مستقل قیام رہا۔ لیکن پرانے زمانے کے علماء بڑے جہانیاں جہاں گرد تھے۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں، اور جہاں بھی گئے اپنے آثار وہاں چھوڑتے گئے۔ اگر ہم آج ان کی مصنفات جمع کرنا چاہتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ ان تمام مقامات میں تفتیش و تجسس کریں، جہاں ان کا قیام ثابت ہے۔ بعض اوقات شمالی ہند کے کسی مصنف کی کتاب دکن ہی میں ملتی ہے، یا اس کے بالعکس، تو اس کی یہی وجہ ہے۔ بعض علماء مختلف اوقات میں مختلف امیروں کے ہاں یا ریاستوں میں ملازم رہے، بلکہ پرانے زمانے میں تو یہ دستور تھا کہ متمول اور صاحب حیثیت آدمی اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے کسی عالم کو اپنے گھر پر رکھ لیتا۔ گلی، محلّے بلکہ اس شہر کے اور طلبہ بھی اسی کے مکان پر آجاتے اور اس طرح مکتب کی سی شکل پیدا ہو جاتی۔ اپنے دوران قیام میں وہ عالم جو کچھ لکھتا، صاحب خانہ ہی کے ہاں جمع ہوتا رہتا۔ جس طرح نیکوں کے گھر میں بُرے پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح پڑھے لکھوں کے گھر میں جاہل، ان پڑھ اور بے سواد اولاد بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کہیں یہ کتابیں نااہلوں کے ہاتھ لگ گئیں، تو چولھے میں جھونک دی گئیں، یا ردّی کے بھاؤ بک کر عطّار کی دکان پر پہنچ گئیں۔ رام پور کے سرکاری کتابخانے میں متعدد مصنفوں کے دستی نسخے اسی طرح جمع ہوئے۔ یہاں کی تقریباً تمام ریاستوں میں اچھے خاصے قیمتی کتاب خانے تھے۔ یہ اسی طرح جمع ہوئے۔ ترکیا اور مصر اور سوریا کے تمام پرانے گھروں میں کتابخانے ہیں، جن میں بڑے نادر مخطوطات خود مصنفوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی بنیاد بھی اسی طرح پڑی۔

اُردو کے مخطوطات پر ایک اور بپتا پڑی۔ اُردو میں تصنیف و تالیف کے آغاز اور ابتدائی دور کا زمانہ وہی تھا، جب انگریزوں اور دوسری یورپی قوموں کی یہاں آمد و رفت ہو چکی تھی۔ اس عہد کا یورپی بالعموم مشرق کی دو ایک زبانیں ضرور جانتا تھا اور یہاں پہنچ کر وہ اس ملک کی بھی ایک آدھ زبان سیکھ لیتا تھا۔ جب وہ یہاں سے واپس جاتا، تو اپنے ساتھ قلمی کتابیں لے جاتا۔ اکثر حالتوں میں وہ عقلمندی اور دور اندیشی کا ثبوت دیتا، جس سے یہ کتابیں ضائع ہونے سے محفوظ رہ گئیں۔ اپنی زندگی بھر تو وہ اُن سے استفادہ کرتا، لیکن مرنے سے پہلے انھیں کسی مرکزی کتابخانے کے نام وقف کر جاتا، بلکہ بیشتر اس کے وارث بھی انھیں کسی کتابخانے کی نذر کر دیتے، یا اس کے ہاتھ بیچ ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُردو کے مخطوطات یورپ کے متعدد ملکوں میں منتشر پڑے ہیں۔

جو شخص بھی کسی موضوع پر کام کرنا چاہتا ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے بنیادی مخطوطے کہاں سے دستیاب ہونگے اور پھر اس کا فرض ہے کہ وہ ان تمام مقامات پر ان کی تلاش کرے۔

جعلی نسخے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی میں مرتب اور محقق کو تنبیہہ کر دی جائے کہ وہ جعلسازوں سے چوکتا رہیں۔ اس سے ان کا بہت سا قیمتی وقت اور مال اور محنت ضائع ہونے سے بچ جائینگے۔

بعض اوقات کچھ لوگ کسی مصلحت سے بالکل نئی اور جعلی چیز مرتب کر کے کسی مشہور و معروف ہستی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اگر محقق اپنے موضوع پر حادی ہے، اور اسے اس سے پورا شغف حاصل ہے تو اسے اس متن کو توجہ سے دیکھنے اور اس کے تمام اطراف کا غور سے مطالعہ کرنے پر اس کے اندر ہی کوئی نہ کوئی سقم ایسا ضرور مل جائے گا، جس سے جعل کا بھانڈا پھوٹ جائیگا۔ ایک مرتبہ قاضی عبدالودود مرحوم نے مجھے ایک جعلی

متن سے متعلق قصہ سُنایا تھا۔ آپ بھی سنیے!

بہار کی پرانی خانقاہ عمادیہ کی تولیت اور سجادہ نشینی سے متعلق کچھ اختلاف پیدا ہو گیا۔ بنائے اختلاف یہ تھی کہ ایک فریق کا دعویٰ یہ تھا کہ دوسرے فریق کے معتقدات فاسد اور بانیِ خانقاہ کے عقائد سے مختلف ہیں۔ اس لیے وہ تولیت کا حقدار نہیں۔ اس پر جناب تمنا عمادی مجیبی پھلواروی کہیں سے ایک رسالہ دریافت کر کے لے آئے جس کا عنوان تھا: "سیدھا راستہ"۔

دعویٰ یہ کیا گیا کہ یہ دستاویز خود حضرت عماد الدین قلندر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس سے ایک فریق کے عقاید کی تائید ہوتی تھی، اور دوسرے کی تغلیط؛ اور غالباً اسی بنا پر تولیت کا فیصلہ ہو گیا۔ خیر، ہمیں اس کے دینی پہلو سے سروکار نہیں۔

اس رسالے کی علمی اور ادبی اہمیت یہ تھی کہ اس پر تاریخ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ درج تھی، جو جولائی ۱۶۷۰ء کے مطابق ہے۔ اس طرح یہ تحریر شمالی ہند کی سب سے قدیم اُردو نثر قرار پائی ہے۔ کربل کتھا بھی اس کے بعد کی چیز ہے جس کا زمانہ ۱۱۴۵ھ/۳۳-۱۷۳۲ء کا ہے۔ یہ رسالہ ایسی چالاکی سے مرتب کیا گیا تھا، اور اس کی زبان بہار کی پرانی بول چال کے اس حد تک مطابق تھی کہ بڑے بڑے صاحب نظر اس سے دھوکا کھا گئے۔ چنانچہ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر قاضی عبدالودود مرحوم نے اسے اپنے رسالے معیار کی اشاعت مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع کر دیا۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ تحریر جعلی ہے اور اس کا جعل صرف ایک لفظ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کے ترقیمے کی فارسی عبارت ملاحظہ ہو:-

الحمد للہ کہ ایں رسالہ در مدتِ دو روز حسبِ فرمایش اہلِ خانۂ خود
در زبانِ مروجۂ دیارِ خود نوشتہ شد کہ مردان و زنان ناخواندہ را
در زبانِ مادریِ ایشاں ذریعۂ معلوماتِ ضروریہ دینیہ گردد و برائے
من ذخیرۂ آخرت شود۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع
العلیم

اگرچہ یہ پوری عبارت ہی اکھڑی اکھڑی سی ہے، لیکن اس میں کلیدی الفاظ "زبان مادری" کے ہیں۔ یہ ترجمہ ہیں انگریزی کی ترکیب "مدرٹنگ" (MOTHER TONGUE) کا، جو اس ملک میں تعلیم کے عام ہونے اور ہمارے لوگوں کے انگریزی میں مہارت پانے کے بعد رائج ہوئی۔ ۱۷۰۷ء (عہد اورنگ زیب) کی کسی تحریر میں اس کے استعمال کا کیا امکان ہے! جس نے بھی یہ رسالہ تصنیف کیا، اسے یہ یاد نہ رہا کہ ۱۷۰۰ء میں بہار کی خانقاہوں کا تو کیا ذکر، اور جگہ بھی انگریزی کا چلن اس حد تک نہیں ہوا تھا کہ وہاں کے ایک دینی رہنما جو انگریزی سے نابلد تھے اسے اپنے عقائد کے کسی ایسے رسالے میں استعمال کرتے، جسے وہ اپنے ان پڑھ یا معمولی پڑھے لکھے مریدوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے قلمبند کر رہے تھے۔

بہار ہی کے ایک اور صاحب نے غالب کے کچھ جعلی خطوط "نادر خطوط غالب" کے نام سے شائع کیے تھے۔ انھوں نے غالب کے مطبوعہ خطوط کے ٹکڑے لیے اور انھیں جوڑ کر یہ خط مرتب کر لیے، اس دعوے کے ساتھ کہ غالب نے یہ ان کے پردادا آغا حسن ہمدانی کے نام لکھے تھے۔ میں نے ان کی قلعی ایک مضمون (مطبوعہ جامعہ دہلی، مارچ ۱۹۴۲ء) میں کھولی تھی۔* جناب قاضی عبدالودود مرحوم نے بھی اس سے متعلق ایک مضمون لکھا، جو معیار (جنوری ۱۹۴۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ یورپ اور امریکہ میں بھی اس قسم کی بیسیوں جعلسازیاں ہو چکی ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف عجائب گھروں اور کتب خانوں سے لاکھوں کروڑوں روپیہ ہتیایا۔ برٹش میوزیم، لندن میں تو ایک کمرہ خاص اسی طرح کی جعلی چیزوں کے لیے مخصوص ہے۔

مخطوطہ

(الف) ایک نسخہ

بیشتر صورتوں میں صرف ایک ہی خطی نسخہ دستیاب ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے میں خاصی

* یہ مضمون اسی مجموعے میں شامل ہے۔

دقت پیش آتی ہے۔ اگر کاتب خوشخط ہے تو شاید کچھ آسانی ہو جائے! ورنہ ایک ایک لفظ کی تعیین اور تصحیح میں بعض اوقات راتیں بیت جاتی ہیں۔

زیرِ نظر نسخہ مصنف یا مولف کا ذاتی نسخہ بھی ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے کاتب کا لکھا ہوا بھی۔ اگر یہ مصنف کا اپنا نسخہ ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔ بعض اوقات ہم ایسے نسخوں میں ایک الجھن سے دوچار ہوتے ہیں۔ نسخہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے، لیکن اس پر اصلاحیں یا حذف و اضافہ کسی اور کے قلم سے ہے۔ یہ عمل خود مصنف کی اجازت سے بھی ہو سکتا ہے، اور اس کے علم کے بغیر بھی۔ کسی شاعر نے اپنی بیاض اصلاح کی غرض سے اپنے استاد کی خدمت میں پیش کر دی۔ مثلاً کتاب خانہ رضائیہ رامپور میں صاحبزادہ عباس علی خان مرحوم بیتاب کے دیوان کا قلمی نسخہ ہے، اس پر کثرت سے غالب کی اصلاحیں ملتی ہیں۔ گمانِ غالب ہے کہ شاعر نے یہ تمام اصلاحیں منظور کر لی ہونگی۔ پس انھیں ہم اصل مخطوطہ ہی کی حیثیت دینگے۔ ہاں، احتیاط کے طور پر چاہیں، تو حاشیے میں شاعر کے اصلی الفاظ کی نشاندہی بھی کر دیجیے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصلی متن مصنف کے ہاتھ کا ہے، یا اُس نے کسی کاتب سے مبیضہ کروایا ہے اور اس کا دیکھا ہوا ہے، لیکن بعد کو یہ مخطوطہ کسی اور کے ہاتھ پڑ گیا۔ اور اس نے دخل در معقولات دیتے ہوئے اس پر اصلاح دے دی۔ اگر اس بات کا یقین نہ ہو کہ یہ تبدیلی مصنف سے استصواب کے بعد ہوئی ہے، تو میرے خیال میں وہ اصلی متن نہیں قرار پائیگا۔ مثال کے طور پر غالبؔ کے اُردو دیوان کا بھوپالی نسخہ لیجیے (جو بعد کو نسخۂ حمیدیہ کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس میں متعدد جگہ پر اصلاحیں ملتی ہیں۔ مرتب نے انھیں غالبؔ سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ ان کا سوادِ خط غالب کے خط سے بالکل مختلف ہے، بلکہ کئی جگہ املا تک درست نہیں، جس کی غالب سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس صورت میں ہم ان اصلاحوں کو خود غالبؔ سے منسوب کرنے میں حق بجانب نہیں ہونگے۔ صحیح طریقہ یہ تھا کہ متن جوں کا توں

لکھا جاتا اور ان تبدیلیوں (اصلاحوں) کی حاشیے میں وضاحت ہوتی۔

اس سے یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ چوں کہ خطی نسخہ مصنّف کا اپنا نسخہ ہے، اس لیے یہ بہرحال، تمام اغلاط سے متبرا ہوگا۔ غلطی ہر ایک شخص سے ہوسکتی ہے۔ خود مصنّف سے بھی اور محض ناقل سے بھی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ واقعی غلطی ہو۔ زبان مختلف ادوار سے گزرتی رہتی ہے؛ ایک لفظ ایک عہد میں مذکر استعمال ہوتا ہے، اور دوسرے عہد میں مؤنث بن جاتا ہے؛ یا اس کے برعکس بعض محاورے بالکل مقامی ہوتے ہیں؛ کسی شہر یا تھوڑے سے علاقے میں ان کا رواج ہوتا ہے: اس کے باہر کوئی انھیں جانتا بھی نہیں۔ مرتّب کا فرض ہے کہ وہ مصنّف کے عہد کی زبان پر حاوی ہو؛ بلکہ وہ دیکھ لے کہ مصنّف کا تعلق جس خطّہ سے رہا ہے، وہاں کوئی خاص لفظ کس طرح بولا یا لکھا جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی زبان کو پیشِ نظر رکھ کر مصنّف کے متن میں تبدیلی کرنے یا اصلاح دینے کا مجاز نہیں۔

یہی حال طرزِ تحریر کا ہے۔ پرانے مخطوطات میں لفظوں کا املا الگ ہے۔ الفاظ کو اعراب بالحروف کے قاعدے سے لکھنے کا عام رواج تھا۔ بعض جگہ یہ زائد حرف صرف مصوتے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن یہ کہیں کہیں، خاص کر نظم میں، انھیں تلفّظ میں پورا ادا نہ کیا جائے، تو مصرع (یا شعر) وزن سے ساقط ہو جائیگا۔ پس مرتّب کو چاہیے کہ وہ خطی نسخے کے طرزِ املا کو علیٰ حالہ قائم رکھے۔

یہ تذکیر و تانیث اور املا کا مسئلہ ایک اور پہلو سے بھی اہم ہے۔

اگر کوئی شخص زبان کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کی تاریخ قلمبند کرنا چاہیے، تو لابد ہے کہ وہ اول سے آخر تک ان مصنّفوں کی تحریریں جمع کرے، جو کسی عہد کی نمائندہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ وہ نہ صرف ان تحریروں سے اصول اور کلیے اخذ کریگا، بلکہ اسے انھیں سے مثالیں بھی پیش کرنا ہونگی۔ اگر ان مصنّفوں کے متن اپنی اصلی حالت میں شائع نہیں ہوئے، بلکہ مرتّبوں نے ان میں من مانی تبدیلیاں کرکے انھیں اپنے عہد کی زبان اور لکھاوٹ کے مطابق کر لیا ہے، تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

زبان کی ارتقائی تاریخ میں ان کی کیا قدر وقیمت رہ جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر کربل کتھا کو لیجیے ۔ یہ کتاب ۴۵-۱۱۴۴ھ/۳۲-۱۷۳۱ء میں مرتب ہوئی ۔ اس میں کمر، سوگند، غرض، اصل، آیت، راہ، وحی، پرواز مذکر لکھے گئے ہیں ۔ ایک جگہ کے سوا جان کو بھی سب جگہ مذکر لکھا ہے ۔ اب یہ سب لفظ مونث استعمال ہوتے ہیں ۔

یہی حال املا کا ہے ۔ شروع میں زبان اور ہجّوں کے اصول متعیّن نہیں ہوئے ۔ ایک مصنّف کسی طرح لکھتا ہے، دوسرا کسی اور طرح، بلکہ بعض اوقات ایک مصنّف کے ہاں بھی یکسانی نہیں ملتی ۔ املا میں بھی سب جگہ ایک اصول کا تتبّع نہیں ہوا ۔ صرف کربل کتھا کی مثالیں ملاحظہ ہوں ۔ وہ، وو؛ کتاب خانی، کتاب خوانی؛ لوہو، لہو؛ دھنواں، دھواں؛ جھوٹا، جھوٹھا؛ توباہ، توبہ وغیرہ ۔

یہ سب اختلافات زبان کی تاریخ مرتّب کرنے میں نہ صرف مفید ہونگے، بلکہ ان کے ذکر کے بغیر بحث مکمل نہیں ہو سکتی ۔ پس کسی پرانے متن کے مرتّب کا یہ فرض ہے کہ وہ انھیں جوں کا توں رکھے اور اپنی طرف سے کوئی تصرّف نہ کرے ۔

ان سب باتوں کے باوجود، اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ خطی نسخے میں واقعی غلطیاں ہو سکتی ہیں ۔ مرتّب کو اپنے علم و فراست سے کام لے کر صحیح ترین متن پیش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے ۔ البتہ وہ کہیں مصنّف کے نسخے سے تجاوز کرتا ہے اور اصلی متن کی جگہ اپنے قیاس سے کوئی اور لفظ لکھتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس تبدیلی کی وجوہ پیش کرے ۔

(ب) متعدد نسخے

بعض اوقات اتفاق سے متعدد نسخے مل جاتے ہیں ۔ یہ سب نسخے

۱ ۔ خود مصنّف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہو سکتے ہیں یا

۲ ۔ مصنّف کے دستخطی نہیں؛ بلکہ اس کے ذاتی نسخے کی مختلف نقلیں؛ گویا سب کم و بیش معاصر ہیں ۔

۳ ۔ بعد کے زمانے کے مختلف اوقات میں کتابت شدہ ہیں ۔

اول اگر تمام نسخے مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، تو اس کی زندگی کا آخری نسخہ لینا چاہیے۔ پہلے نسخوں کے اختلاف حواشی میں درج کر دیے جائیں تاکہ مصنف کے خیالات کی تدریجی شکل سامنے آجائے۔ ہر ایک مصنف اپنی تحریروں میں رد و بدل کرتا رہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ نقشِ ثانی ہر صورت میں نقشِ اول سے بہتر ہی ہو؛ عین ممکن ہے کہ اس نے تبدیلی میں زبان و بیان کے پہلو سے تنزل کی مثال قائم کر دی ہو۔ لیکن مرتب کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ صرف اس متن کو مرتب کر رہا ہے جس طرح سے مصنف اسے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے حسن و قبح پر بحث کرنا، اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔ میں غالب کے اردو کلام سے مثال پیش کرتا ہوں۔

غالب کا دیوان ان کی زندگی میں پانچ مرتبہ چھپا۔ ۱۸۴۱ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء، ۱۸۶۳ء۔ بادی النظر میں ۱۸۶۳ء کا نسخہ ان کی زندگی کا آخری متن ہے۔ اور ہمیں مندرجۂ صدر اصول کے مطابق اسی کو اپنے زیرِ ترتیب متن کے لیے اساس بنانا چاہیے۔ لیکن یہ مغالطہ ہے۔ ۱۸۶۳ء کا نسخہ دراصل مبنی ہے ایک قلمی نسخے پر جو غالب نے خود لکھوا کر ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خان والیِ رامپور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ جب اس نسخے کی کتابت مکمل ہو گئی تو نواب ناظم کے پاس بھیجنے سے پہلے انھوں نے اسے دیکھا اور کہیں کہیں کچھ لفظی تبدیلی کر دی۔ یہ نسخہ کتابخانۂ رامپور میں محفوظ رہا۔ اور جب غالب ۱۸۶۰ء میں وہاں گئے، تو نواب میر زخشاں کی فرمایش پر وہ ان کے لیے اس کی نقل لیتے آئے۔ یہی نسخہ بعد کو شیو نراین آرام نے اپنے مطبع مفید الخلائق، آگرہ میں چھاپ کر ۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔ پس، اگرچہ اشاعتی ترتیب میں یہ نسخہ غالب کی زندگی میں سب سے آخر میں چھپا، متنی ترتیب میں یہ ۱۸۵۷ء میں رکھا جائیگا۔

۱۸۵۷ء میں اس نسخے کی کتابت کے وقت غالب نے متن میں جو تبدیلیاں کی تھیں، اصولاً غالب کو چاہیے تھا کہ انھیں اپنے کلام میں داخل کر لیتے۔ لیکن انھوں نے

ایسا نہیں کیا۔ اس کے بعد دیوان مطبع احمدی، دہلی سے ۱۸۶۱ء میں چھپا۔ انھوں نے اس نسخے کی کاپی خود دیکھی تھی، لیکن انھوں نے ۱۸۵۰ء والی تبدیلیاں اس میں شامل نہیں کیں۔ پھر اسی مطبع احمدی والے مسودے کو چھپنے کے لیے مطبع نظامی، کانپور میں بھیج دیا۔ یہ نسخہ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ پس غالب کی زندگی کا آخری نسخہ ۱۸۶۲ء کا ہے (نہ کہ آگرے والا ۱۸۶۳ء کا مطبوعہ) یا اس کی اصل، ۱۸۵۰ء والا خطی نسخہ۔ اگر آج ہم غالب کا دیوان مرتب کرنا چاہیں، تو ہمیں اسی مطبع نظامی، کانپور والے نسخے کو اساس قرار دینا ہوگا۔

میں نے اس پر نسبتاً تفصیل سے بحث کی ہے کیونکہ مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم نے اپنے مرتبہ دیوان غالب (نسخۂ عرشی) کی اساس ۱۸۵۰ء کے قلمی نسخے کو قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۰ء والے نسخے کی تبدیلیاں (اصلاحیں) اتنی اہم ہیں کہ ہم اسے بالکل نیا نسخہ قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔ ہمیں ان تبدیلیوں کی اہمیت سے انکار نہیں؛ لیکن اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ان اصلاحوں کو دیوان کے بعد کے نسخوں (مطبع احمدی، ۱۸۶۱ء؛ مطبع نظامی، ۱۸۶۲ء) میں شامل نہ کر کے غالب نے انھیں عملاً رد کر دیا۔ اگر وہ ان تبدیلیوں کو اپنے کلام کا مستقل جزو سمجھتے، تو انھیں اس خطی نسخے سے بعد کی اشاعتوں میں شامل کر لیتے۔ یہ انھوں نے نہیں کیا۔ گویا انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ یہ تبدیلیاں وقتی طور پر ان کے خیال میں آئی تھیں۔ ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ غرض اب ۱۸۵۰ء کے رامپوری خطی نسخے کی تبدیلیاں صرف اختلافِ نسخ کی شکل میں استعمال ہو سکتی ہیں، اساسی متن کی حیثیت سے نہیں۔ اگر یہ تبدیلیاں بلحاظ کلام کے بہتر تھیں، تو ہم یہ کہیں گے کہ غالب کا تنقیدی شعور ناقص تھا کہ اسے اچھے برے میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن اساسی طور پر کلام وہی رہیگا، جو وہ مرنے سے پہلے ۱۸۶۲ء میں دنیا کے لیے مرتب کر گئے۔

یہاں اتفاق سے غالب کے اردو دیوان کے یہ نسخے مطبوعہ تھے۔ لیکن اگر سب قلمی ہوتے، جب بھی اسی اصول پر عمل ہوتا۔ بشرطیکہ اس بات کا یقین ہو کہ آخری نسخہ ان کا دیکھا

ہوا ہے۔ میں یہاں مشہور بدھ بادشاہ اشوک کے کتبوں کی مثال بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اشوک نے بیسیوں کتبے سِلوں اور لاٹوں پر کندہ کروائے۔ یہ سب اس کی زندگی کے ہیں اور ان میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ چونکہ یقین سے نہیں معلوم ہوسکا کہ کس ترتیب سے کندہ ہوئے تھے۔ اس لیے ہمارے لیے تمام متن مستند ہیں۔ چنانچہ علمائے تاریخ نے ان سب کو یکجا چھاپا ہے۔ مختصراً، اصول یہ ہوگا کہ مصنّف کے متعدد نسخوں میں سے جو سب سے آخر میں اس کی نظر سے گذرا ہے وہ اساسی متن ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ خطی نسخے مصنّف کی وفات کے بعد کے زمانے میں وجود میں آئے۔ ان میں سے بنیادی متن وہ نسخہ قرار پائے گا جو مصنّف کے سب سے آخری نسخے سے قریب ترین ہے۔ ظاہر ہے کہ بعد کے یہ نسخے نقل ہوئے ہونگے، مصنّف کی زندگی کے نسخوں کی اِن نقلوں میں ممکن ہے کہ بعض اِن نسخوں سے تیار کی گئی ہوں، جو خود مصنف نے اپنے عمل سے یعنی اس آخری نسخے کے ذریعہ سے رد کر دیے تھے، جو اصولاً بعد کے تمام نسخوں کے لیے اساس کا کام دیگا۔ پس پہلے کے نسخوں کی یہ نقلیں ہمارے مفید مطلب نہیں ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، حدیثِ نبوی کے متداول مجموعے شارعِ اسلام صلعم کی وفات کے بہت بعد مرتب ہوئے تھے جمع کرنے والوں نے اسناد کا اصول وضع کیا، یعنی جو شخص ان سے حدیث بیان کر رہا ہے، قطعاً لازم ہے کہ اس کے اور حضرت رسول کریم صلعم کے درمیان راویوں کا سلسلہ منقطع نہ ہو، اسے اسناد کہتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ کسی خاص حدیث کے لیے ایک جامع کے پاس شارع تک پانچ راوی، یعنی واسطے ہیں۔ اگر اسی حدیث کے لیے کسی دوسرے جامع کے ہاں چار راوی ہیں، تو اس کی سند اونچی مانی جائیگی۔ اور وہ اسی لیے قابلِ ترجیح ہوگی۔

خطی نسخوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہم تک جو خطی نسخے پہنچے ہیں، ان میں سے ہم اسے ترجیح دینگے جس کے اور مصنّف کے آخری نسخے کے درمیان کم از کم واسطے ہیں۔

تیاری

اب تک ہم خطی نسخوں کی فراہمی اور نسخۂ اساسی کے انتخاب کی بحث کرتے رہے ہیں۔ اب آخری مرحلہ اس کے پڑھنے کا ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے تیاری کی ضرورت ہے۔ مرتب کا فرض ہے کہ وہ یہ کام شروع کرنے سے پہلے اس فن یا موضوع کی اور کتابیں کثرت سے پڑھے۔ ہر ایک علم کی اپنی مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ جو مصنف بھی اس سے متعلق کوئی بات لکھے گا، ناگزیر ہے کہ وہ اپنی تحریر میں بار بار انھیں استعمال کرے۔ اگر مرتب نے اپنے مطالعے سے ان اصطلاحات اور ترکیبوں سے مزاولت اور مہارت پیدا کرلی ہے، تو اسے خطی نسخے کے پڑھنے میں آسانی ہوگی۔ اگر وہ کوئی خاص لفظ پڑھ نہیں سکا، تو بھی اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئیگی۔ اپنے وسیع مطالعے اور دوسرے مصنفوں کے اسلوب سے واقفیت کی بنا پر اسے استدلال کے رخ یا فقرے کی ساخت سے اندازہ ہو جائیگا کہ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات مصنف کسی اصطلاح کا ترجمہ بھی کر دیتا ہے۔ اس مطالعے سے یہ معما بھی آسانی سے حل ہو جائیگا

دوسرے مقام پر مرتب کا فرض یہ ہے کہ زیرِ نظر خطی نسخے کو دو تین مرتبہ پڑھے۔ اسے بار بار پڑھنے سے وہ لکھاوٹ کی خصوصیات سے مانوس اور پھر ان پر حاوی ہو جائیگا۔ ہر ایک شخص کی پسند، ناپسند مختلف ہے۔ کوئی کسی لفظ کو ایک طرح سے لکھنا پسند کرتا ہے، کوئی دوسری طرح سے۔ بعض کاتب اپنی خامیوں میں پختہ ہوتے ہیں، وہ کسی لفظ کی غلط کتابت کرتے ہیں اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا، کہ وہ غلط لکھ رہے ہیں۔ تذکرۂ سرور (عمدۂ منتخبہ) کے کاتب نے 'کثیف' کو ہر جگہ 'ث' کی بجائے 'س' سے لکھا ہے۔ غالب انگریزی لفظ "لارڈ" کو 'لارد' لکھتے تھے اور 'اکٹھا' کو بالعموم 'اکھٹا'، جو اس لفظ کا عوامی تلفظ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاتب کثیف کے معنی نہیں جانتا تھا۔ یا غالب کو لارڈ یا اکٹھا کا صحیح تلفظ معلوم

نہیں تھا۔ مرتب کو چاہیے کہ کتاب چھاپتے وقت متن میں 'کیف' کی جگہ 'کیثف' لکھے، 'لاڑد' کی جگہ "لارڈ" اور 'اکھٹا' کی جگہ 'اکٹھا'، جو صحیح لفظ یا صحیح تلفظ ہے؛ حاشیہ میں البتہ صورتِ حال کی وضاحت کر دی جائے۔ اور سب سے آخر، وہ حتی الوسع اپنے گرد وہی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے، جو اس کے خیال میں مصنف کی کتاب لکھتے وقت رہی ہوگی۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو اس کا کام آسان بھی ہو جائیگا اور دلچسپ بھی۔

قرأت و ترتیب

سامی رسم الخط میں بیشمار نقطے ہیں۔ ان نقطوں کے غلط جگہ پر لگ جانے سے لفظوں کا مفہوم تک بدل جاتا ہے۔ پرانے کاتب اوّل تو نقطے لگاتے ہی نہیں تھے، اور اگر کبھی یہ زحمت گوارا کی بھی، تو اس کی پروا نہیں کی کہ یہ صحیح جگہ پر لگا یا نہیں۔ یہی حال 'ک'، اور 'گ' کا ہے۔ کاتب بالعموم 'گ' کا دوسرا مرکز نہیں لگاتے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

پرانی انگریزی سرکار کے ایک سکتر تھے، ایلیٹ صاحب، انھوں نے ہندستان کے اسلامی عہد کی بہت ساری فارسی تاریخیں جمع کیں۔ اور ان کا ترجمہ انگریزی میں کر کے انھیں متعدد بڑی بڑی جلدوں میں شائع کیا۔ اب اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا ہے کہ کون سی جلد میں کہاں۔ کوئی ۶۰ برس پرانی بات ہے — ایک جگہ مصنف نے لکھا تھا: 'دیوار را کج کردہ'، کاتب نے حسبِ عادت دوسرا مرکز نہیں لگایا تھا یعنی خطی نسخے میں تھا: 'دیوار را کج کردہ'۔ ایلیٹ نے اس کا ترجمہ تبکلف "ٹیڑھا" کر دیا۔ اور اس کا ذرا خیال نہیں کیا کہ آخر دیوار کے ٹیڑھی ہو جانے سے عمارت اور عبارت کا کیا حال ہوگا!

غرض مخطوطہ پڑھنے میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کاتب پورے الفاظ نہیں لکھتے، نقطے غائب یا غلط جگہ لگے ہونگے، یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

بعض اوقات لفظ یاے معروف اور یاے مجہول دونوں سے بامعنی ہو سکتا ہے۔ (اگرچہ شاذ و نادر ہی ہو) اس صورت میں ایک کو ترجیح دے کر اسے متن میں لکھیے اور دوسری قرأت کو حاشیے میں لکھ کر تشریح کر دیجیے۔ مثلاً، ہم غالب کا ایک شعر سنیے:

نواب علاءالدین احمد خان اپنے صدر مقام لوہارو میں مقیم ہیں۔ انھوں نے گرما کے آغاز میں غالب کو لوہارو آنے کی دعوت دی۔ لوہارو جیسا کہ سب جانتے ہیں، ریگستان کے درمیان نخلستان کی صورت میں واقع ہے۔ جواب میں غالب نے ایک منظوم خط لکھا، جس کا دوسرا شعر تھا:

سرِ آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم کہ دلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں

دیوانِ غالب مرتب کرتے ہوئے میں نے پہلے مصرع کے متن میں اندھے کو ترجیح دی اور لفظ 'اندھے' پر حاشیہ لکھا۔ غالباً یہاں اسے نقل کر دینا مفید ہوگا:

> آندھی۔ پرانے طرزِ تحریر کے لحاظ سے یہ لفظ آندھی اور اندھے دونوں طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ چونکہ گرمی کے موسم میں لوہارو میں ریگستانی علاقہ ہونے کے باعث بہت آندھیاں چلتی ہیں جن کا رخ دلّی کی طرف سے ہوتا ہے، اس لیے 'آندھی' کی قرأت بھی درست ہو سکتی ہے۔

میرے نزدیک مرجح 'اندھے' تھا، لیکن چونکہ 'آندھی' بھی بامعنی ہے اور درست بھی ہو سکتا ہے، اس لیے ضرورت پیش آئی کہ یہ حاشیہ لکھا جائے۔

جہاں بھی دو قرأتیں درست ہونے کا امکان ہے اسی اصول پر کاربند رہنا چاہیے۔

ایک اور مثال دیکھیے:

غالب کے ایک قصیدے کا شعر ہے:

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

عام طور پر مطبوعہ دیوان میں مصرع ثانی یوں چھپا ملتا ہے:

توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

وزن ٹھیک ہے، مصرع بامعنی بھی ہے (آخر متعدد شارح اس کی شرح کرتے آئے ہیں)، لیکن اگر ہم غالب کی افتادِ طبع کو نظر میں رکھیں، تو اس نتیجے پر پہنچینگے کہ اس نے چاہتا لکھا ہوگا۔ جب گھوڑا جوش میں دوڑنا چاہتا ہے، اور سوار باگیں کھینچے ہوئے اسے روکتا ہے، تو وہ جوش اور بےچینی میں لگام کو چبانے لگتا ہے۔ یہ گویا احتجاج ہے، اس پابندی کے خلاف جو سوار کی طرف سے اس پر کی جا رہی ہے اگر کہیں ذرا سی ڈھیل بھی دے دی جائے، تو گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگتا ہے' یہی مضمون یہاں بیان ہوا ہے۔ غالب قصیدے میں غزل لکھنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے موقع پیدا کرنے کو استعارے سے کام لیا۔ غرض صحیح 'چابتا' ہی ہے۔ چاہتا غلط ہے۔ غالباً عام قاری کا ذہن اس لفظ کی طرف اس لیے نہ گیا کہ اب ہم 'چباتا' (چبانا مصدر) کہینگے ؛ چابتا' (چابنا مصدر) پرانی زبان ہے (غالب نے ایک اور جگہ اسی مصدر سے 'چابنے لگتا ہوں' بھی لکھا ہے) اگر استعارے کے اطراف اور غالب کے زمانے کی زبان پیش نظر رہتی، تو یہ غلطی نہ ہوتی۔

متن میں جن اشخاص کے نام آئے ہیں اُن کا تعین کرنا چاہیے۔ ان کی نشاندہی کے علاوہ ان کی مختصر سوانح عمری لکھی جائے۔ اس میں البتہ ایک بات کا خیال رہے کہ اگر نام کسی ایسی مشہور و معروف شخصیت کا ہے کہ توقع کی جا سکتی ہے، قاری اس سے واقف ہوگا، تو تفصیلی حاشیہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کی زندگی کی اہم تاریخیں دے دیجیے، تاکہ اس کا زمانہ معلوم ہو جائے، پوری سوانحعمری لکھنے سے اجتناب کیجیے۔ مثال کے طور پر خاندانِ مغلیہ کے بادشاہوں کے نام ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کا نام متن میں آجائے تو پہلے چھ بادشاہ (بابر سے اورنگ زیب تک) اتنے اہم اور مشہور ہیں کہ کوئی باخبر پڑھنے والا ان سے بےخبر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان پر حاشیہ نہیں لکھا جائیگا۔ بعد کے بادشاہ اتنے مشہور نہیں ہیں، ان سے متعلق اگر آپ چاہیں تو ایک آدھ سطر اہم تاریخوں کے ساتھ لکھ دیجیے اور

بس ، اس سے زیادہ بھرتی کہلائیگی۔ ہاں اگر کسی ایسے شخص کا نام آیا ہے جو عام طور پر معروف نہیں یا اس کے حالات سہل الحصول نہیں، تو قاری کی سہولت کے لیے آپ حالات فراہم کر کے حاشیے میں لکھ دیجیے۔ لیکن یہاں بھی ایجاز و اختصار مدّنظر رہے، ورنہ آپ پر بیجا طول نویسی اور عدم توازن کا الزام عائد ہوگا۔

اگر مصنف نے تلمیحات استعمال کی ہیں ، یا دوسروں کے کلام کی تضمین کی ہے، یا شعری کتاب میں نام کے ساتھ یا نام کے بغیر شعر آ گئے ہیں ، تو مرتب کا فرض ہے کہ ان سب کا کھوج نکالے۔ اور اختلاف نسخ کے ساتھ حوالوں کا تعیّن اور شعروں کی تخریج کرے

اگر خوش قسمتی سے کسی متن کے ایک سے زیادہ نسخے دستیاب ہو جائیں تو اس سے کئی سہولتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پہلے تو متن ہی کی تعیین کا بنیادی مسئلہ ہے جس پر سارے کام کا دارومدار ہے۔ اگر آپ کو دو یا زیادہ نسخے مل گئے ہیں ، تو آپ کسی لفظ سے متعلق شک و شبہہ کی گنجائش کم ہو جائیگی۔ ایک کاتب نے اسے مشکوک طریقے پر لکھا ہے، تو امکان کم ہے کہ دوسرے نے بھی اس کی پیروی کی ہو۔

اگر آپ نے تمام شرطوں کو لحاظ رکھتے ہوئے اساسی نسخے کا انتخاب کر لیا ، تو اسی کے متن کو بنیادی قرار دیں ، اور دوسرے تمام نسخوں کو اختلاف کے لیے استعمال کیجیے الّا یہ کہ بداہتہً معلوم ہو جائے کہ اساسی نسخے کا متن ناقص ہے اور کسی دوسرے نسخے کا ٹھیک ہے۔ اس صورت میں آپ دوسرے متن کو لے کر اساسی نسخے کے الفاظ حاشیے میں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بہت بڑی ذمے داری ہے ، اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لیے آپ کو مضبوط دلائل پیش کرنا پڑیںگے۔

بعض اوقات اختلاف نسخ میں تمام ایسے الفاظ درج کر دیے جاتے ہیں، جو اساسی نسخے کے علاوہ دوسرے مخطوطوں میں ملتے ہیں، خواہ ان کے کچھ معنی ہوں یا نہیں ، یہ بھی ٹھیک نہیں۔ اختلاف نسخ اسی حد تک مفید ہے، جب تک اس سے متن با معنی رہتا ہے۔ جونہی یہ بنیادی شرط ساقط ہو گئی، اختلاف نسخ بیسود ہو گیا۔ بعض اوقات ایسے

لفظ بھی حاشیے میں درج کردیے جاتے ہیں، جو بالکل بے معنیٰ ہوتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ مخطوطے کا کاتب منقول عنہ نسخے کی عبارت ٹھیک طور پر پڑھ نہیں سکتا؛ وہ اٹکل سے کبھی پر مکھی مارتا ہوا ایک لفظ لکھ دیتا ہے، جو اصلی نسخے کی تحریر سے ملتا جلتا ہے۔ اگر یہ لفظ بے معنی ہے تو یہ قطعاً اس لائق نہیں ہے کہ آپ اسے اختلافِ نسخ کی ذیل میں لے آئیں۔ صرف دو صورتیں ایسی ہیں، جہاں مرتب کو اپنی طرف سے حذف و اضافے کی اجازت ہوتی ہے، ورنہ عام حالات میں وہ اساسی نسخے کی عبارت کی پابندی پر مجبور ہے۔ اول، جہاں عبارت صاف طور پر ناقص ہے، یعنی کوئی لفظ لکھنے سے رہ گیا ہے۔ ایسی صورت میں وہ سیاق و سباق سے دیکھے کہ ساقط لفظ کونسا ہو سکتا ہے جس کے اضافے سے عبارت مکمل اور بامطلب ہوجاتی ہے۔ اب بھی اس کا یہ حق نہیں ہے کہ نشاندہی کیے بغیر اسے متن میں داخل کردے، بلکہ اسے اپنا اضافہ کبھی داریکٹیوں کے اندر رکھنا چاہیے، تاکہ یہ نمایاں رہے، اور معلوم ہو کہ یہ لفظ اصلی متن میں نہیں تھا، مرتب کا اضافہ ہے۔ اسی طرح بعض اوقات کاتب لکھنے میں تکرار کر جاتا ہے، یا کوئی اور لفظ اضافہ کر دیتا ہے، جو اصلی مصنف نے نہیں لکھا تھا۔ اگر مرتب کو یقین ہو کہ مصنف نے یہ کلمہ نہیں لکھا ہوگا، تو وہ اسے حذف کر دے۔

متفرق

یہاں تک ہم اصلی متن کی قرأت، تصحیح و تعیین اور ترتیب سے بحث کرتے رہے ہیں بیشک، جہاں تک اصلی نسخے کا تعلق ہے، یہ کام بھی کفایت کرتا ہے۔ لیکن جدید علم ترتیب میں تحشیہ بھی بہت اہم ہو گیا ہے۔ اس کے مطابق مرتب کا فرض ہے کہ وہ متن کے حواشی میں اختلافِ نسخ کے ساتھ کچھ اور چیزوں کا بھی اضافہ کرے۔ اس میں یہ چند اہم باتیں ہیں:

(۱) اگر مخطوطے میں ایسے الفاظ آئے ہیں، جو مرورِ زمانہ سے اب مستعمل نہیں رہے؛ یا استعمال تو ہوتے ہیں، لیکن ان کے معنی بدل گئے ہیں؛ یا ان کا استعمال پہلے کسی

خاص محاورے یا ترکیب میں خاص معنوں میں ہوتا تھا، جو اب نہیں رہا، تو مرتب ان تمام الفاظ کی فہرست بنائے اور بتائے کہ اب معنی اور استعمال میں کیا تبدیلی ہو گئی ہے۔

(۲) اگر کچھ ایسے لفظ ہیں، جو اپنی قدامت کی وجہ سے بالکل متروک ہو گئے ہیں، تو ان کی فہرست الگ ہو۔ ان کے معنی بتائے جائیں۔

(۳) حتی الوسع نامانوس الفاظ کے استعمال کی بعد کے اساتذہ کے کلام سے سند دی جائے۔

(۴) اگر یہ الفاظ دخیل ہیں، یعنی اپنی اصل میں مقامی نہیں، بلکہ کسی دوسری زبان سے لیے گئے ہیں، تو ان کی نشاندہی کی جائے، اور بتایا جائے کہ اصلی زبان میں ان کے کیا معنی تھے اور ہمارے ہاں پہنچ کر کیا ہو گئے۔

(۵) شروع میں مرتب دیباچے میں مخطوطے (یا مخطوطوں) کی پوری کیفیت بیان کرے۔ یہ کہاں سے آیا: کن لوگوں کے پاس رہا؛ اس کے اصلی ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ اس کی کیا حالت ہے! ان سب باتوں پر حتی الامکان روشنی ڈالی جائے۔ اگر ہو سکے، تو خطی نسخے کے اصلی مصنف کے حالات جمع کیے جائیں اور اس کے تعارف کے ساتھ تصنیف کا زمانہ متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ یا پھر اس کی علمی لسانی تاریخی حیثیت اور اہمیت کی بحث ہو۔

یہ وہ چند کم از کم مطالبے ہیں، جن کو پورا کرنے کی جدید علم ترتیب و تحشیہ کسی مرتب سے توقع رکھتا ہے۔ اور یوں تو ہر ایک موضوع کے اپنے اپنے مقتضیات ہیں ہی، اور انھیں پورا کرنے کے لیے ان میں حذف و اضافے کی ہمیشہ گنجایش رہیگی۔

مصنف کی دوسری کتابیں

- ذکرِ غالب
- فسانۂ غالب
- تلامذۂ غالب
- گفتارِ غالب
- وہ صورتیں الٰہی
- تذکرۂ معاصرین (۱)
- تذکرۂ معاصرین (۲)
- تذکرۂ معاصرین (۳)
- تذکرۂ معاصرین (۴)
- قدیم دلّی کالج
- عورت اور اسلامی تعلیم
- اسلامیات
- ایرانی شاہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال
- میرزا غالب (انگریزی)
- حالی (انگریزی)

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلّی

ایک خواب اور

مصنف : سردار جعفری

صفحات: 204

قیمت :-/77 روپے

سحر کے پہلے اور بعد

مصنف : سعید الظفر چغتائی

صفحات: 152

قیمت :-/64 روپے

ایک چادر میلی سی

مصنف : راجندر سنگھ بیدی

صفحات: 116

قیمت :-/48 روپے

شریف زادہ

مصنف : مرزا رسوا

صفحات : 200

قیمت : -/62 روپے

باتیں لاہور کی

مصنف : سوم آنند

صفحات: 276

قیمت :-/78 روپے

الفاظ کا مزاج

مصنف : غلام ربانی

صفحات: 136

قیمت :-/60 روپے

آزمائش کی گھڑی

مصنف : سید حامد

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

فی الفور

مصنف : یوسف ناظم

صفحات: 112

قیمت :-/53 روپے

ISBN 978-81-7587-624-8

₹ 91/-